

زیدی کا حشر

مجنوں
گورکھپوری

... اکاڈمی کراڈک روڈ (ناگپور سٹی)

زیدی کا حشر

(مصنف کا پہلا افسانہ)

مجنوں گورکھپوری

سی۔ پی اُردو اکاڈمی، کراڈک روڈ۔ ناگپور سٹی

طبع اوّل مارچ ۱۹۴۶ء

مطبوعہ

انتظامی پریس حیدرآباد دکن

جس کتاب پر عثمان اقبال یا قادر نیازی کے قلمی دستخط نہ ہوں وہ مسروقہ سمجھی جائیگی۔

قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ (۱۲؍۱)

دستخط

ع۔ اقبال

پنڈت سوامی کرشنانند سوختہ
کی اُردو خدمات کے نام!

اراکین: سی پی اُردو اکاڈمی ناگپور

انتساب

تمہارے نام

کہ تمنائے تو از خاطرِ ناشاد رود
داغ عشق تو گلے نیست کہ برباد رود

مجنوں

کچھ اپنے متعلق

سی پی اردو اکاڈمی اگست ۱۹۴۳ء میں قائم ہوئی۔ اسوقت سے آج تک اس کا مقصد یہی رہا ہے کہ ہندوستان میں نئے ادبی رجحانات کو پھیلایا جائے اور اب یہ کوئی چھپی ہوئی بات بھی نہیں رہی کہ جدید اردو ادب کی دنیا وسیع تر ہوتی جارہی ہے۔ دوران جنگ میں نئے تخیلات کے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے ناشرین بھی میدان عمل میں آگئے، "زیدی کا حشر" بھی ایسے ہی نوجوانوں کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ سی پی اردو اکاڈمی کے سامنے سی پی و برار میں نشر و اشاعت سے متعلق ایک ٹھوس پروگرام بھی موجود ہے

زیدی کا حشر ——— آج زیدی کا حشر جس کیساتھ مجنوں کی کئی یادیں وابستہ ہیں ایک کتابی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے جو اردو ادب کے لئے لازوال سرمایہ (Immortal Treasure) سے کسی قدر بھی کم نہیں - مجنوں اردو دنیا کا مخلص ادیب نئی طرز اور نئے افکار کا معمار جس نے اس کاغذی دنیا میں ایسے ایسے غیرفانی خاکے پیش کئے ہیں جسے اردو دنیا ہرگز نہیں بھلا سکے گی۔ "زیدی کا حشر" مجنوں کے ایسے ہی افکار کا پرتو ہے۔

ناگپور

مارچ ۱۹۴۶ء

عثمان اقبال

تردید وصیت

تا بہ کے قصۂ مستقبل و ماضی خواندن
باخبر باش کہ افسانہ نظر می بندد

اگر میرا حافظہ میرے ساتھ دغا نہیں کر رہا ہے تو یہ شعر بیدل کا ہے، اور ایک ایسی ذہنی کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے جو کسی حال میں صحت اور ترقی کی علامت نہیں سمجھی جا سکتی۔ ماضی کے ساتھ مستقبل کو بھی افسانہ کی نظربندی سمجھنے لگنا یقیناً مریضانہ ذہنیت ہے، اور اس بات کی دلیل کہ زندگی سے جی اُچاٹ ہو چلا ہے اور ہر چیز اصلیت اسے بیگانہ معلوم ہو رہی ہے۔

ماضی کی طرف بار بار مُڑنا اور رہ رہ کر اُس پر حسرت کی نظر ڈالنا تو رجعتی میلان کہلاتا ہے اور گذری ہوئی منزلوں کو نگاہ میں لئے ہوئے آگے بڑھتے جانا اور ماضی اور حال دونوں سے بہتر مستقبل کے حصول کی دُھن

ہیں لگے رہنا ترقی پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن اس ذہنی کیفیت کو کیا کہا جائے جس میں آدمی کو ماضی اور مستقبل دونوں بے تعبیر خواب معلوم ہونے لگیں اور دونوں میں سے کسی کو بھی تصوّر سے جی خوش نہ ہو سکے!

آج کل میں بھی کچھ ایسی ہی ذہنی کیفیت سے گزر رہا ہوں لیکن بہرحال آج مجھے ماضی میں الٹے پاؤں سفر کرنا ہے اور جس منزل کو چھوڑے ہوئے بیس سال ہو چکے ہیں اسی پر جاکر پھر قیام کرنا ہے۔

"زیدی کا حشر" ۱۹۲۵ء میں لکھا گیا۔ افسانہ کے میدان میں یہ میرا پہلا قدم تھا اس سے پہلے میرے گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ میں کبھی افسانہ لکھونگا۔ اور "زیدی کا حشر" لکھتے وقت یا اس کے بعد بھی افسانے لکھنے کا نہ کوئی ارمان تھا نہ کوئی امکان۔ اس وقت میرے ذہنی مشاغل کچھ زیادہ ٹھوس اور ثقہ تھے۔ میرا فکری میلان فلسفہ اور اس سے متعلق دوسرے موضوعات کی طرف زیادہ تھا۔ اور زندگی کے مجرد کلیات اور نظری حقایق پر غور کرنے میں مجھے زیادہ لذّت ملتی تھی۔

یہ میری ذہنی تربیت اور تیاری کا زمانہ تھا اور میرا زیادہ وقت لکھنے میں نہیں بلکہ پڑھنے میں صرف ہوتا تھا اور چونکہ خارجی

فرصت اور فراغت کی فراوانی تھی اس لئے میرے مطالعے کا دائرہ وسعت اور نوعیت دونوں کے اعتبار سے غیر محدود تھا یہ کہتے ہوئے کسی قسم کا پندار یا احساس برتری میں اپنے اندر نہیں پاتا بلکہ مجھے تو عرصہ سے یہ احساس ہے کہ میں بہت کافی حد تک دینوی معیار سے صرف اس لئے خسارے میں رہا کہ اپنی عزیز یا غیر عزیز عمر کا زیادہ حصہ "کاغذی دنیا" میں صرف کر ڈالا اور عام اصطلاح میں کوئی کام کی بات نہ سیکھی۔ لیکن اس وقت تو بس ایک دھن تھی۔ جو میری ساری زندگی کی ضامن تھی۔ ایک ولولہ تھا جو آپ اپنا مقصود تھا۔ اور سارے مفاد اور انتہائی نشاط کا کفیل تھا۔ آج سود و زیاں کی اصطلاحات کے ماتحت اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا اور بادل کے سوا اپنے ہاتھ کچھ نہیں رہا اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کھویا اور کیا پایا۔ غالب کا ایک بڑا تامل انگیز شعر ہے :۔

هرچه از جاں کاست در مستی به سود افزودمش
هرچه با من ماند از هستی زیاں نامیدمش

میری زندگی کا بھی آخری لکھا جو کھا ہی رہا۔

خیر میں یہ کہہ رہا تھا کہ اول تو اس زمانہ میں جہاں تک لکھنے

کا تعلق تھا۔ نثر کی طرف میری توجہ کم تھی۔ زیادہ تر شعر کہتا تھا۔ اور شاید ایک صاحب نظر کا یہ کہنا غلط نہیں کہ میں نے "سنجیدہ خیال کو مروجہ موسیقیت کے ساتھ جوڑ کر اپنی شاعری کو سنگین بنادیا ہے" یہ رائے ۱۹۳۲ء میں دی گئی اور اس سے چھ سات سال پہلے میں خود اپنی توانائی اور ناتوانی دونوں سے بخوبی خبردار ہو چکا تھا۔ مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ نہ شاعری میرے بس کی ہے اور نہ میں شاعری کے بس کا۔

یہ تھا میرا عام طبعی میلان اور یہ تھی میری ذہنی اٹھان جب کہ ایک شام کو بغیر کسی قسم کی تیاری کے "زیدی کا حشر" لکھنے کا ارادہ کر کے بیٹھ گیا۔ لکھنے کی تقریب کیا ہوئی؟ اس کا ایک مرتبہ "خواب و خیال" کے مقدمہ میں مختصر ذکر کر چکا ہوں اور مختصر ہی ذکر یہاں بھی ممکن ہے۔ "نگار" میں نیاز صاحب کا افسانہ "شہاب کی سرگذشت" مسلسل شائع ہو رہا تھا۔ میرے ساتھ میری ایک عزیز خاتون بھی جن کی ہستی مجھے اب تک بہت زیادہ عزیز ہے اس افسانہ کو پڑھ رہی تھیں اور وہ اس سے بے انتہا مرعوب تھیں نیاز صاحب کی قدرت بیان اور ان کے طرز کی دلکشی کا میں ہمیشہ معترف رہا اور اس افسانہ میں بھی میں ان کے

میں بھی میں ان کے اسلوب کی کامیابی کا مداح تھا لیکن افسانہ میں مجھے کوئی مرکزی تصوّر نہیں ملتا تھا۔ اور صحیح معنوں میں تحلیل نفسی کے بھی کوئی آثار مجھے نظر نہیں آرہے تھے۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی احساس تھا کہ سارے افسانہ کی بنیاد شہاب کی خارج المرکز Eccetric انفرادیت پر ہے۔ جو عام دنیائے انسانیت کے لئے کسی طریقہ سے صحت اور برکت کی چیز نہیں ہوسکتی۔ اس قسم کے دنیا سے نرالے کردار مغربی افسانوں میں بھی کم نہیں۔ میری نظر اس وقت آسکر وائلڈ کی "پکچر آف ڈورین گرے" اور برنارڈ شا کا ناول "دی ان سوشل سوشلسٹ (The unsocial socealist) خصوصیت کے ساتھ تھے۔ میں نے "شہاب کی سرگزشت" کے بارے میں جب اپنے خیال کا اظہار کیا تو خاتون اس کی متحمل نہ ہوسکیں۔ اور کہہ اٹھیں کہ یہ سب نہ لکھ سکنے کی باتیں ہیں اور میں خواہ مخواہ تنقیص کر رہا ہوں۔ اسی شام کو میں "زیدی کا حشر" لکھنے بیٹھ گیا۔ اعصاب میں جوانی کی اکڑ تھی۔ شہاب اور "زیدی" اور "حسنین" جیسے کردار کے دو چار نمونے نگاہ میں تھے۔ صوفیہ اور اس کے انجام کی مثالیں بھی میرے گرد و پیش تھیں۔ اور پھر سب

سے بڑی تقویت اپنا مطالعہ تھا۔ قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھا تو ایک نشست میں ایک تہائی لکھ ڈالا۔ اسی اثنا میں نیاز صاحب گورکھپور تشریف لائے۔ میں نے ان کو جتنا لکھ چکا تھا۔ پڑھنے کے لئے دیا۔ انھوں نے مسودہ رکھ لیا اور پھر اس کو لے کر بھوپال چلے گئے۔ اور مجھ سے کہا کہ باقی حصہ لکھکر جلد روانہ کروں۔

اب سے بیس پچیس سال پہلے تک اُردو میں جس طرز تحریر کی ادبی حیثیت سے دھوم تھی وہ ابوالکلام آزاد اور نیاز فتحپوری اور دبستان "نقاد" اور دبستان "مخزن" کے لکھنے والوں کی بنائی ہوئی طرز تحریر تھی۔ اور فضا میں اس وقت کے سربرآوردہ مغربی انشاپردازوں کے اثرات پھیلے ہوئے تھے جس نئے لکھنے والے کو دیکھئے آسکر وائلڈ۔ والٹر پیٹر۔ برنارڈ شا کی طرز تخیل اور میلان فکر کی نقل اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یا پھر ٹیگور اور اسی جماعت کے دوسرے لکھنے والوں کی نیم متصوفانہ اور نیم متغزلانہ جذباتی تخیلیئت اور انھیں کی رومانی طرز انشاء کا اثر اردو نظم ونثر میں سرایت کئے ہوتے تھا۔ ٹولسٹائے اور بعض دوسرے روسی فسانہ نگاروں کا اثر چند بالکل نوجوان ادیبوں کے ذریعہ اردو میں ابھی داخل ہونا شروع ہوا تھا

میں بھی اپنے ماحول کی مخلوق تھا اور گرد و پیش کی فضا میں جو ارتعاشات پھیلے ہوئے تھے۔ ان کو کچھ شعوری اور کچھ غیر شعوری طور پر اپنے اندر جذب کر رہا تھا۔ خود میں مغربی ادب اور فلسفے کے مطالعے میں اپنے اکثر ہم عصروں سے آگے تھا اس لئے کہ مطالعہ میرے لئے نشہ کا حکم رکھتا تھا اور مجھے اس کی لت سی ہو گئی تھی بالکل اسی طرح جس طرح لوگوں کو شراب یا افیون کی لت ہوتی ہے "زیدی کا حشر" ان تمام اسباب و علامات کا حامل ہے۔

لیکن اگر تھم کر غور سے مطالعہ کیا جائے تو شاید یہ معلوم کرنے میں دیر نہ لگے کہ "زیدی" کا انداز میرا فطری اور اصلی انداز نہیں ہے۔ "زیدی کا حشر" لکھنے کے سال ہی بھر بعد میں نے اپنا دوسرا اور تیسرا اور چوتھا افسانہ لکھا جن کے عنوانات "گہنا" "سمن پوش" اور "حسنین کا انجام" ہیں۔

زیدی کے اسلوب کا ان سال بھر بعد کے افسانوں کے اسلوب سے موازنہ کیا جائے تو یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ میرا اپنا اسلوب کیا ہے۔ مگر "زیدی کا حشر" کے بعد میں پھر برابر افسانے کیوں لکھتا رہا؟ اس کے تنہا ذمہ دار نیاز صاحب ہیں انھوں نے میرے دوسرے ہی افسانے کے بعد اصرار کے ساتھ کہنا شروع کیا کہ میرے مزاج کو

فسانہ نگاری سے خلقی مناسبت ہے اور میں سوا افسانوں کے کچھ نہ لکھوں میں نے بھی سوچا کہ افسانے لکھوں گا تو پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ ہوگی اور اگر ٹھوس علمی ادبی مضامین لکھتا رہا تو صرف چند چیدہ اور برگزیدہ لوگوں کے حلقے میں جانا پہچانا جاؤں گا یوں ہوئی میرے فسانہ نگاری کی ابتدا پھر تو کچھ عرصے تک واقعی سوا افسانوں کے کچھ نہیں لکھا یہاں تک کہ ڈیڑھ دو ہزار صفحے لکھ ڈالے اور میرے جاننے والے مجھے خالص فسانہ نگار سمجھنے لگے۔

فسانہ نگاری کے ایام میں میرے سامنے صرف ایک نصب العین تھا اور وہ یہ کہ اردو میں بھی اس قسم کے افسانے آجائیں۔ جیسے مغربی زبانوں میں لکھے جا چکے ہیں اس جذبے کے ماتحت میں نے مغرب کے ہر بڑے فسانہ نگار اور ناول نگار کے مطالعے سے اثر لیکر فسانے لکھے ہیں۔ ٹالسٹائی ۔ ٹورگنف ۔ جارج ایلیٹ ۔ طامس ہارڈی۔ جارج گسنگ ہاتھارن۔ ہنری جیمس۔ الگزنڈر کیوپرین سبھی کے اثرات میرے افسانوں میں بکھرے ہوتے ملیں گے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ مجھے لوگ خواہ مخواہ ہارڈی کا مقلد اور شوپنہار کا پیرو سمجھنے لگے۔ حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ پانچ افسانے میں نے صرف ہارڈی کے ناولوں کے نمونہ پر لکھے ہیں۔

اب تک میرے افسانوں کے نو مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ابھی ایک اور مجموعہ کا سامان رسالوں میں بکھرا پڑا ہے۔ لیکن "زیدی کا حشر" نہ کسی مجموعہ میں شامل کیا گیا اور نہ الگ سے چھپا۔ بلکہ میں نے اپنے سب سے پہلے مجموعہ "خواب و خیال" کے مقدمہ میں وصیت کے طور پر بہت صاف یہ لکھ دیا تھا۔ کہ میں "زیدی کا حشر" کتابی صورت میں شائع کرنا نہیں چاہتا۔ اور اس کو نہ میرے افسانوں کے کسی مجموعہ میں شامل کیا جائے۔ نہ الگ سے اس کو پھر کبھی شائع کیا جائے۔ میں نے یہ سخت وصیت کیوں کی تھی اور اب اس وصیت کو رد کیوں کر رہا ہوں؟ میں اس بات کو واضح کر چکا ہوں کہ "زیدی کا حشر" ایک خاص زعم اور عصبی تناؤ کے زیر اثر لکھا گیا تھا سال ہی بھر کے اندر میرے لکھنے کا انداز بدل گیا۔ اور پھر جو کچھ میں نے لکھا اس کے ساتھ "زیدی کا حشر" نمایاں طور پر بے میل اور بے محل نظر آنے لگا۔ یہ سچ ہے کہ "زیدی" میں مختلف مباحث پر جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ وہ چاہے مغربی مصنفوں سے ماخوذ ہوں چاہے طبعزاد ہوں وہ میرے اصلی خیالات ہیں یعنی اس زمانے میں میں ان پر سچے دل سے یقین رکھتا تھا۔ لیکن افسانہ کے لحاظ سے میں بہت جلد اپنے کو اس سے اجنبی پانے لگا۔

اور اس کا اسلوب نگارش بھی مجھے غیر مانوس معلوم ہونے لگا
انھیں تمام اسباب کی بنا پر میں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ اب "زیدی
کا حشر" دوبارہ کسی مجموعہ میں اشاعت نہیں پائیگا۔ اور یقین مانئے
کہ پھر کبھی "زیدی کا حشر" مجھے بھول کے بھی یاد نہیں آیا۔ لیکن
ابھی چند ہی مہینے ہوئے کہ سی۔ پی اردو اکاڈیمی کے روح رواں
نیازی صاحب نے مجھے "زیدی کا حشر" اس طرح یاد دلایا کہ پھر
نہ میں اس کو بھلا سکتا تھا نہ اس سے تجاہل برت سکتا تھا۔
نیازی صاحب میری کوئی کتاب سی۔ پی اردو اکاڈیمی کی طرف سے
شائع کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کئی کتابوں کے نام تجویز کئے لیکن
معلوم ہوتا ہے نیازی صاحب پہلے ہی سے فیصلہ کر چکے تھے کہ کیا چیز
شائع کریں گے۔ انھوں نے "زیدی کا حشر" مانگا اور پھر اسی پر
اصرار کرنے لگے۔ میرے لئے اب جو مشکل تھی وہ خاصی پیچیدہ تھی
نہ صرف "زیدی کا حشر" انداز اور اسلوب کے اعتبار سے میری بعد
کی تحریروں سے بے جوڑ اور غیر متجانس تھا بلکہ اب میرے خیالات
بھی نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ چکے تھے۔ اور جن خیالات کا اظہار
"زیدی کا حشر" میں کر چکا تھا۔ ان سے مجھے کوئی ذہنی لگاؤ اب
نہیں رہا۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میں وصیت کر چکا

تھا۔ کہ "زیدی" اب پھر نہ چھپے۔ میں نے بہت دیر تک غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ میری وصیت کچھ زیادہ سوچی سمجھی ہوئی بات نہیں تھی۔ اگر ایک پندار اور عصبی اکڑ نے مجھ سے "زیدی کا حشر" لکھوایا تو یہ بھی ایک قسم کا پندار اور عصبی تناؤ ہی تھا کہ میں نے "زیدی" کو اپنی لکھی ہوئی چیزوں کی فہرست ہی سے خارج کر دیا میں لاکھ اس سے انکار کروں لیکن رہے گی وہ میری ہی لکھی ہوئی چیز اور بہر حال مجھی سے منسوب کی جائیگی۔ اس سے بر طرف ہو کر یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ بدلتی ہوئی زندگی کیساتھ ساتھ انسان کے خیالات و افکار بھی بدلتے ہی رہتے ہیں لیکن یہ تو بڑی ریاکاری اور خود فریبی ہوگی اگر پختگی اور رسیدگی کی نئی منزل پر پہنچ کر گزری ہوئی منزلوں کے تمام اکتسابات کو حرف غلط سمجھ کر محو کر دیا جائے۔ ماضی میں کھوئے رہنا تو یقیناً ایک باو ہوائی میلان ہے لیکن ماضی سے انکار کر دینا بھی ایک ایسا بلاّپن ہے جس کو صرف ضعف دماغ اور فتور حواس ہی سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ انسان کے جسم کی بالیدگی۔ اس کے دل و دماغ کی اٹھان۔ اس کے جذبات و افکار کا ارتقا ایک تاریخی تسلسل ہوتا ہے۔ ماضی سے حال اور حال سے مستقبل پیدا

ہوتا ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم شروع یا درمیان کے کسی دور سے انکار کریں یا تجاہل برتیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ "سالے کہ خوش است از بہارش پیدا است" تو ایک مصنف کے بچپن اور اوائل شباب کی وہ قلمی کوششیں جن کو "طفلانیات Juvenilia" کہتے ہیں ایک اشاریہ ہوتی ہیں جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا ذہنی موڑ اور اس کے احساس و فکر کی سمت کیا ہے اور وہ کہاں پہنچنا چاہتا ہے۔ انھیں سب باتوں کو سمجھ کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ "زیدی کا حشر" کو شائع ہونا چاہیے تردید وصیت پر اس لئے کسی کو بازپرس کا حق نہیں ہے کہ اگر ایک وصیت کے بعد کوئی شخص زیادہ مدت تک درستیٔ حواس کے ساتھ زندہ رہ جائے تو نہ صرف اس کو حق حاصل ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی وصیت پر نظرثانی کرے اور اگر اس میں کوئی نقص ہو تو اس کو بدلے یا واپس لے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ "زیدی کا حشر" میرا سب سے پہلا افسانہ ہے اور وہ چھپ رہا ہے سب سے آخر میں۔ اب میرے پاس صرف تین چار افسانے اور ہیں جو اِدھر اُدھر رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ اور جن کو کسی مجموعہ کی اشاعت

ثانی میں شامل کر دیا جائے گا۔

زندگی کیا افراد کی کیا جماعت کی برابر بدلتی رہتی ہے اور نئی شکلیں اختیار کرتی رہتی ہے۔ ایک ہیئت جب اپنی غایت اور اپنے مقدر کی تکمیل کر چکتی ہے تو وہ دوسری ہیئت کے لئے جگہ چھوڑ دیتی ہے۔ اور دوسری ہیئت پہلی ہیئت سے بہتر ہوتی ہے۔ مجھے بچپن سے اس حقیقت کا شدید احساس تھا اور اس احساس نے ہمیشہ میری رگوں میں بالیدگی اور انبساط کی کیفیت پیدا کی۔ میں نے تغیر اور انقلاب کو ہمیشہ لبیک کہا اور میں نے اپنے خیالات و افکار کو زندگی کے بدلتے ہوئے معیار اور نئے مطالبات سے ہم آہنگ رکھنے کی برابر کوشش کی۔

میری ادبی زندگی کی ابتدا شعر کہنے سے ہوئی چند ہی سال میں میں نے اپنی رہبائیوں اور نارسائیوں کا صحیح اندازہ کر کے نثر کا راستہ لیا۔ جس کو کچھ ہی دنوں کے تجربہ کے بعد اعتماد کے ساتھ اپنا راستہ سمجھنے لگا۔ کم و بیش دس سال تک افسانے لکھتا رہا اور افسانہ نگار مشہور ہو گیا۔ اس درمیان میں بھی کبھی کبھی کچھ اکتا کر کوئی تنقیدی یا فلسفیانہ مضمون لکھ دیتا تھا۔ لیکن ۱۹۲۵ء میں اردو نثر میں ایک شدید خلا

محسوس ہونے لگی۔ میں انگریزی کا ایم۔ اے کرچکا تھا۔ اور اردو ایم۔ اے کی تیاری کر رہا تھا۔ مجھے ضابطہ اور تسلسل کے ساتھ اردو ادب کے مختلف اصناف کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اردو میں نہ صرف جدید مغربی معیار کی تنقیدوں کا قحط ہے بلکہ حالیؔ آزادؔ اور شبلیؔ کی کوششوں کے بعد اردو تنقید کے میدان میں کچھ عجیب سناٹا سا رہا اس احساس نے میرے اندر ایک نئی تحریک پیدا کی۔ میں افسانے لکھتے لکھتے کچھ تھک بھی گیا تھا اور پھر مجھے یہ دیکھکر بھی اطمینان تھا کہ افسانہ لکھنے والوں کی ایک نئی نسل پیدا ہو رہی ہے جو ہونہار ہے اور ترقی کریگی لیکن تنقید کی طرف سے لوگ غافل سے تھے۔ جب میں انگریزی تنقیدیں پڑھتا تھا تو میرے اندر ایک ولولہ پیدا ہوتا تھا کہ کاش اُردو میں بھی اس رنگ کی کوششیں ہوتیں۔ اسی جذبہ نے مجھے مجبور کیا کہ میں اب تنقیدیں لکھوں چنانچہ ۱۹۳۵ء سے لے کر اب تک جس قدر لکھا ہے اس کا زیادہ سے زیادہ حصہ تنقید ہی ہے۔

گذشتہ دس سال میں میں نے جتنے تنقیدی مضامین لکھے ہیں اُن کی ضخامت کم نہیں ہے لیکن مجھے یہ احساس

ہے اور اس احساس سے مجھے دکھ ہے کہ میں جتنا لکھ سکتا تھا، اور جس شغف اور محویت کے ساتھ لکھ سکتا تھا پچھلے چھ سات برسوں سے نہیں لکھ رہا ہوں۔ میرے لکھنے کی رفتار سال بہ سال کم ہوتی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اب صفر ہوا چاہتی ہے اور پھر جو کچھ لکھا بھی اس میں وہ انہماک۔ وہ جوش اور وہ گرمی نہیں ہے۔ جو اس سے پہلے کی تحریروں میں شاید محسوس ہوئے بغیر نہ رہے۔

ممکن ہے کہا جائے کہ یہ تو ہوتا ہی ہے۔ جوں جوں عمر آگے کھسکتی جاتی ہے۔ اعصاب و جوارح ڈھیلے اور قویٰ مضمحل ہوتے جاتے ہیں اور آدمی کی تخلیقی اپج بھی شست ہوتی جاتی ہے لیکن یہاں یہ بات نہیں ہے اول تو میں تغیر اور انقلاب کے تصوّر سے ہمیشہ خوش ہوا ترقی کو میں زندگی کی فطرت اصلی سمجھتا ہوں۔ اور ترقی کے یہ معنیٰ کہ ماضی اور حال دونوں کا جائزہ لیتے ہوے مستقبل کی طرف آگے بڑھو۔ اس لحاظ سے ہر آنے والے کل کو آج اور گزرے ہوتے کل دونوں سے بہتر ہو جانا چاہیئے اور کلی اور مجموعی حیثیت سے انسانی زندگی کی تواریخ یہی رہی ہے۔ اس لئے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ امتداد عمر کے ساتھ ساتھ قوتیں ترقی کرنے کے بجاے روز

بروز گھٹتی جاتی ہیں تو غصہ آتا ہے۔ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے جبکہ ایسا کسی حال میں اور کسی قاعدہ سے نہ ہونا چاہئیے۔ دوسرے میرے غم و غصّہ کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مجھے شدّت کے ساتھ احساس ہے اور یقین ہے کہ میرے اندر ابھی تخلیقی تحریک کی کمی نہیں ہے میں بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں اور بہت کچھ لکھ سکتا ہوں۔ ابھی نہ جانے کتنے تصوّرات کتنے منصوبے اور کتنے خاکے ہیں۔ جو بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ذہن میں موجود ہیں اور جن کو میں الفاظ میں منتقل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن ادھر پانچ چھ سال سے کچھ ایسی بُحرانی کیفیت چھائی رہتی ہے کہ کسی طرح ارادہ اور عمل کے درمیان کوئی رشتہ قائم ہی نہیں ہو پاتا۔ اور میں اپنے کو ایک ایسی پیکار میں مبتلا پاتا ہوں جو بیک وقت خارجی اور داخلی دونوں معلوم ہوتی ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ ایک طرف تو میرے نئے ولولے میرے دل میں ایک شورش مچائے رہتے ہیں دوسری طرف خارجی اسباب و حالات مجھے اس قدر خستہ و درماندہ کئے رہتے ہیں۔ کہ میں باوجود اس کے کہ روز رات کو "نیت شب بخیر" کہہ کر بستر پہ جاتا ہوں لیکن دوسرے روز

شام ہوتے ہوتے پھر ہمت ہار جاتی ہے۔ اور کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا۔ بیدل نے شاید۔ ایسے ہی خلفشار کو اس شعر میں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے:

رنگ طاقت سوخت اما وحشت آغازم ہنوز
چشم برخاکستر بالاست و پروازم ہنوز

ایسے ہی عالم میں انسان بسا اوقات پیچھے کی طرف مڑ مڑ کر حسرت کے ساتھ دیکھنے لگتا ہے اور رجعتی میلان کا شکار ہو جاتا ہے۔

انفرادی زندگی کی ادنیٰ اور گندی کلفتیں اکثر انسان کی مائل بہ ترقی قوتوں کو سلب کر کے اس کو معذور و مجبور کر دیتی ہیں۔ میں بھی بعض اوقات ماضی اور حال کا مقابلہ کرتا ہوں اور حال کے دم گھٹا دینے والے کثیف اور تھکا دینے والے مشاغل اور تردّدات پر غور کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب شاید زندگی مستقبل میں کچھ کرنے کا موقع نہ دے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ میں اپنے ماضی کو غنیمت سمجھنے لگتا ہوں مگر چونکہ میرے مزاج کو اس ذہنی حالت سے کوئی اصلی اور فطری لگاؤ نہیں ہے اس لئے بہت جلد میرے اندر ایک

بغاوت کا جذبہ حرکت کرنے لگتا ہے اور ہر امید کے خلاف میں اپنے دل میں یہ امید پیدا کرلیتا ہوں کہ اس وقت تھکا ہارا اور عاجز ضرور بیٹھا ہوں لیکن اگر زندگی باقی ہے تو اس سے بہتر دن بھی ضرور آئیں گے اور مجھے اس کے موقعے ضرور ملیں گے کہ جو حوصلے ابھی باقی ہیں ان کو بھی پورا کرسکوں۔ نہیں کہہ سکتا کہ یہ امید پوری ہوگی یا نہیں لیکن

"کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ"

میں بھی اپنی اسی امید پر جی رہا ہوں اور حسب معمول خلوص اور استقلال کے ساتھ وہی "نیت شب بخیر" رکھتا ہوں جس کو فرصت اور موقع کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ اب یہ اور بات ہوگی اگر اسی درمیان میں یہ معلوم ہو جائے کہ "جینے کی امید" ہی سرے سے غلط تھی۔

مجنوں گورکھپوری

امام باڑہ۔ میاں بازار

گورکھپور

۲۲ رنومبر ۱۹۴۵ء

زیدی کا حشر

(۱)

شباب کی شور انگیز مصروفیتوں کا تجربہ بجز ان ہستیوں کے جو ابھی مراحِل طفولیت سے باہر نہیں نکلی ہیں کس کو نہیں ہے؟ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب انساں کو نہ ماضی کی یاد افسردہ کرسکتی ہے، اور نہ مستقبل کی فکر مضمحل بنا سکتی ہے، اس عہد النباس میں کانٹے بھی پھول نظر آتے ہیں، ریت بھی پانی معلوم ہوتی ہے اور صحرائے بسیط ایک خوشنما گلزار کی صورت اختیار کرلیتا ہے اور اگر اتفاق سے کہیں حسن و عشق کی کوئی روداد اسمیں شامل ہو جائے تو پھر کائنات کی کوئی دوسری چیز ہمارے لئے جاذب نظر نہیں بن سکتی۔

زیدی ایک بست سالہ نوجوان علیگڈھ میں بی۔ اے کا طالب علم میرا ہم جماعت اور قریبی رشتہ دار تھا۔ وہ فطرت کیطرف سے مردانہ حسن کے ساتھ ایک بیچین دل بھی لایا تھا۔ اس کے

اضطراب خلقی کی وجہ سے ہم لوگ اُسے غیر مستقل مزاج کہا کرتے تھے، وہ ہر دلچسپی کی چیز سے بہت جلد سیر ہو جایا کرتا اس کی منطق نرالی تھی جسے ہر شخص نہیں سمجھ سکتا اور اوّل اوّل میں بھی اسے "جوشِ طفلانہ" سے زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا، وہ کالج میں فلسفہ کا متعلم ہے اور بالذات بھی فلاسفر تھا۔ اس کی زندگی کے دو متبائن رُخ تھے، وہ جوانی کی بے فکریوں کے باوجود عدل و انصاف کا علمبردار تھا۔ وہ خشک مزاج تھا۔ لیکن حامیان صداقت کی جانبداری میں اپنی جان تک ہلاک کردینے پر آمادہ رہتا، ایک دفعہ ایک مذہبی جلسہ میں پیغمبروں کے معصوم و منزہ من اللہ ہونے پر کوئی مولانا تقریر کر رہے تھے زیدی سے نہ رہا گیا فوراً آپ بھی کھڑے ہو گئے، اور کہنے لگے "فطرت ہر شخص کو دنیا میں معصوم بھیجتی ہے۔ کوئی گنہگار نہیں پیدا ہوتا۔ معصیت تو دماغ انسانی اور اس کے ماحول کی پیداوار ہے، ہم میں اور انبیاء میں صرف اتنا فرق ہے کہ ہم اپنی معصومیت آپ کھو دیتے ہیں اور وہ اس کو قائم رکھتے ہیں۔ اگر کوشش کیجائے تو ہم میں سے ہر شخص نبوّت پا سکتا ہے۔" آپ تو اتنا کہہ کر بیٹھ رہے اور آپ کی مخالفت میں صدائے تکفیر مدتوں بلند رہی،

اس کی فلسفیت کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ لوگ عموماً اس سے متنفر تھے' مگر وہ اس کی مطلق پرواہ نہ کرتا وہ کہا کرتا تھا کہ میرے لئے عروج نفسی حاصل کرنا اسی وقت ممکن ہوگا جب کہ دنیا کا ہر متنفس مجھ سے بیزار ہو جائیگا۔

کائنات کا وہ "غبار رنگیں" جسے عورت کہتے ہیں اور جس کی ساری رنگینی اسی ایک لفظ میں مضمر ہے۔ ہمارے نادر الخیال اور بدیع الافکار زیدی کے لئے ایک جداگانہ عالم اپنے اندر رکھتا تھا، تاہم وہ کسی کا حلقہ بگوش نہ تھا۔ حسن کا مجسمہ اپنے بہترین اسلحہ کو کام میں لانے کے بعد بھی اب تک اس پر فتح نہ پا سکا تھا، احباب کو یقین ہو چلا تھا کہ زیدی عالم جمادات کا ایک فرد ہے جس پر محبت جیسی نازک شئے اپنا نقش نہیں جما سکتی اس وقت تک یہ اس کی زندگی کا تاریک ترین پہلو تھا۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا "زیدی کیا تمھارے سینہ میں دل نہیں ہے' تمھارا یہ حسن و شباب رومانیت کا متقاضی ہے' تم ہر چیز سے اتنا جلد اُکتا کیوں جاتے ہو؟"

زیدی۔ (مسکراکر) اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ اب تک دنیا کوئی ایسا منظر پیش ہی نہ کر سکی' جو مجھے ہمیشہ کیلئے اپنا

گرویدہ بنا کر میرے دل و دماغ کو رومانیت سے مملو کر دیتا!

میں۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ تم نے کسی عورت سے راہ ورسم پیدا کی اور چند روز کے بعد اس سے اس طرح کنارہ کش ہو گئے کہ گویا کبھی کی ملاقات ہی نہ تھی یہ کیا فلسفہ ہے؟ کیا تم کسی کی محبت نہیں کر سکتے؟

زبیدی (متانت سے) میں تمھاری طرح محبت اور بہیمیت کو مترادف الفاظ نہیں سمجھا، مجھے آج تک کوئی ایسی متبرک ہستی نظر سے نہیں گزری جو میری محبّت کی ذمّہ دار ہو سکتی ہو امینہ ایک شریف خاندان کی لڑکی ہے، مگر باوجود انٹرنس تک تعلیم یافتہ ہونے کے وہ نہایت خود غرض اور نفس پرست دل کی مالک ہے۔ وہ اس کی متمنّی ہے کہ میں اس کی محبت میں گرفتار ہو جاؤں بلا لحاظ اس کے کہ میرا حشر کیا ہو گا، میں اس عورت کو کبھی اپنے دل پر حکمراں نہ ہونے دونگا، جو میرا دل چھین لینا چاہے، یاد رکھو کہ محبت ایک لطیف اور بے ضرر شئے ہے جس کو کسی ضرر پہنچانے والی ہستی سے وابستہ کرنا اس کی بے قدری ہے۔

میں۔ آخر رشیدہ میں کون سا عیب تھا؟ وہ تو کنواری تھی اور اپنی تمام رعنائیاں لئے ہوئے اپنے والہانہ جذبات

کے ساتھ۔ اپنے زرخیز آنسوؤں کے ساتھ اپنی شرر ریز آہوں کے ساتھ تم پر قربان ہونے کو تیار تھی۔

زیدی۔ اس کی قربانی کی کمزور بنا ہیجان عصبی پر تھی، اور اب رشیدہ کو شاید میری پرواہ بھی نہ رہ گئی ہو، نہیں تو وہ قاسم کے ساتھ شادی ہوجانے کے بعد سکون کی زندگی نہ بسر کرسکتی۔

میں۔ تو پھر وہ کب تک تمھاری بے التفاتیوں کے باوجود "امیدوار محبت" بنی رہتی؟

زیدی۔ تاوقتیکہ میں اس پر پورا اعتماد کرکے اس سے محبت نہ کرنے لگتا۔ اس کو اپنی "امیدواریوں" میں ثابت قدم رہنا چاہیئے تھا۔ عورت کا اقتضائے فطرت یہی ہے جنس لطیف کے خمیر میں ضد کا عنصر تمام عناصر پر غالب ہوتا ہے۔ تم جانتے ہو میں ایک مدّت سے "نسائیات" کے مطالعہ میں کس مستعدی کے ساتھ مصروف ہوں، میں ان سب عورتوں سے ملا، ان کے دلوں کو انسانیت سے بیگانہ اور حیوانیت سے لبریز پایا حسن کی الوہیت کو آلودۂ خباثت دیکھکر ناممکن تھا کہ ان سے خلوص و ارتباط پیدا کرکے میں بھی اپنے دل کے آئینہ کو دھندلا کرلیتا، میں کسی ایسی عورت کی جستجو میں ہوں جو میرے کیفیات محبت کی

حاصل ہو سکے کیونکہ محبت قوت ارادی کو مکمل بنا دیتی ہے، اس کو خوب ذہن نشین کر لو میں جب عورت کی محبت کروں گا۔ اس کو اپنی بہیمیت کی قربان گاہ پر بھینٹ نہیں چڑھاؤں گا۔ میرے موجودہ تلوّن سے تم یہ نتیجہ ہرگز نہ نکالنا کہ میں محبت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہوں تو اس طرح اپنے در مقصود کی تلاش کر رہا ہوں اور بس۔

زیدی کی طویل تقریر سے میں اکتا گیا تھا، اس لئے یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا "تمھاری ساری عمر اسی مبہم جستجو میں ختم ہو جائیگی مگر اپنا در مقصود نہ پا سکو گے، تم تو انسان میں وہ اوصاف دیکھنا چاہتے ہو جو بشریت سے بعید ہیں تمھاری منطق کیا ہے مستبعدات کا ایک مجموعہ ہے۔"

زیدی۔ مستبعدات اور متناقضات تو زندگی کے اجزائے ترکیبی ہیں لیکن آنے والی گھڑیاں بتا دیں گی کہ جس کی مجھے جستجو ہے وہ دنیا میں نایاب نہیں ہے۔

اس کے بعد چونکہ رات ہو چکی تھی میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور زیدی کی گفتگو پر دل ہی دل میں تبصرہ کرنے لگا۔ زیدی ان فلاسفروں میں تھا جن کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر مرد کے لئے ایک

ایسی عورت ضرور پیدا ہوئی ہے جس سے وہ محبت کر سکے، یہ اور بات ہے کہ دونوں کو باہمی واقفیت حاصل کرنے کا موقع عمر بھر نہ ملے، کیونکہ ممکن ہے مرد ہندوستان میں پیدا ہوا ہو اور اس کی موضوعہ محبت امریکہ میں، ایسی حالت میں دشوار ہے کہ ان کو ایک دوسرے سے ملنے کا اتفاق ہو سکے اور اگر ہو جائے تو وہ "جذبۂ محبت" جو مدتوں خاموش رہ چکا ہے۔ خود بخود متحرک ہو جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ ارتقائی مدارج طے کرتا ہوا اپنی حد انتہائی تک پہنچ جاتا ہے پھر نتیجہ جو کچھ ہو۔ بہر حال محب و محبوب اپنے اپنے مناصب فطرت ہی کی طرف سے لے کر آتے ہیں یہ کوئی اس دنیا کی ایجاد نہیں ہے یہ ہے اس طبقۂ فلاسفہ کے خیالات کا خلاصہ جس کا زیدی ایک زبردست پیرو تھا۔ وہ گروہ جو یہ کہتا ہے۔ کہ ہر عورت سے محبت کی جا سکتی ہے، زیدی کے تیر ملامت کا مستقل آماجگاہ تھا، اس کا خیال تھا کہ ایسے لوگ نہ صرف دلوں کو دھوکا دیتے ہیں بلکہ خود اپنے نفس کو بھی فریب میں مبتلا رکھتے ہیں۔ وہ کہتا تھا "ہر مرد ہر عورت سے محبت نہیں کر سکتا البتہ نسبت زوجی ہر عورت سے پیدا کی جا سکتی ہے"

اس موقع پر میں یہ بتلا دینا چاہتا ہوں کہ زیدی کا تمام تر فلسفہ "ادعائی" (Dogmatic) تھا وہ اپنے کسی دعوے کے اثبات میں دلائل و براہین پیش کرنا اپنی وجدانیت کی تضحیک سمجھتا تھا۔ اگر کوئی کسی دعوے پر اس سے ثبوت مانگتا تو ترشی کے ساتھ جواب دیتا کہ "کسی خیال کو مستحکم اور مقبول بنانے کے لئے ثبوت تلاش کرنا" ارتیابیوں" (Sceptics) کا کام ہے جن کا شیوہ ہی اشتباہ و تشکیک ہے۔ ڈیکارٹس (Decarts) جو ارتیابی جماعت کا مشہور حامی تھا کہتا ہے کسی شے کی حقیقت پر آنکھ بند کرکے یقین کرتے رہو جب تک کہ نہ یقین کرنے کی کوئی معقول وجہ نہ ہو۔ ڈیکارٹ تمھیں دائمی اضطراب اور بےچینی کی جانب بلاتا ہے اور میں ابدی سکون و اطمینان کی طرف مدعو کرتا ہوں۔ مجھے تو اپنے داعیات پر کامل اعتماد ہے۔ میں کسی سے یہ نہیں چاہتا کہ وہ میرا ہم آہنگ اور مقلد بن جائے پھر دلیل یا ثبوت پیش کرنے کی کوئی وجہ؟ تم کو میرے خیالات کی صحت میں اشتباہ ہے اور چاہتے ہو کہ میں بھی انھیں ناقص سمجھ کر ترک کردوں اس لئے تم پر اس اشتباہ کی توجیہ فرض ہے" یہ تھی اس کی ادعائیت

جس کی مثال دنیا میں شاید نہ مل سکے، زیدی کے فلسفہ کی صحت میں اکثر احباب کو شک تھا مگر حقیقت یہ کہ اپنے شک کی توجیہہ کوئی بھی نہ کر سکتا تھا۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ زیدی جرح و تعدیل کے اصول سے نا آشنا تھا، اور نا آشنا ہو کیسے سکتا تھا، جب کہ وہی منطق وہی فلسفہ جو کالج میں سب پڑھتے ہیں، اس نے بھی پڑھا تھا۔ جرح و تعدیل سے وہ چڑھتا ضرور تھا۔ مگر اس کے دو اسباب تھے۔ اول تو وہ کسی حد تک ضدی واقع ہوا تھا دوسرے اس کا ایمان یہ تھا۔ کہ سر حقیقت میں ایک خاص مقناطیسیت ہوا کرتی ہے، جو کسی نہ کسی وقت زمانہ کو بڑے سے بڑے حائلات کے باوجود اپنی طرف کھینچ لیا کرتی ہے، اور میرے نزدیک بھی یہ ایک بدیہی امر ہے۔

دوسرے روز اتوار تھا میں نے ہاتھ منھ دھوکر چائے پی اور زیدی کے پاس جانے کو تیار ہی تھا کہ حسنین جو ہماری ہی کلاس میں پڑھتا تھا آگیا، حسنین ان لوگوں میں سے تھا جو زیدی کے نظریات کو "توہمات" کہا کرتے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ رومانیت سے صرف یہ مراد ہے کہ عورتوں کا پندار نسوانی

ہر طرح فنا کر دیا جائے اس کی لغت میں محبت کے یہ معنے تھے کہ ہر شب ایک نئی عورت کو اپنے جذبات عاشقی کا یقین دلاؤ اور لذّت یاب ہونے کے بعد نمود آفتاب سے پیشتر بے پروائی کے ساتھ ایک غلط انداز نگاہ ڈال کر نیم بسمل کی طرح اس کو عمر بھر تڑپنے کے لئے چھوڑ دو۔ ہم دونوں زیدی کے پاس روانہ ہوئے، زیدی کے کمرے میں پہنچ کر میں نے قصداً رات کی بحث پھر چھیڑ دی میں نے حسنین کو مخاطب کر کے کہا "زیدی صاحب۔ کسی ایسے "عنقا" کی تلاش میں سرگرداں ہیں جس کی وہ محبت کر سکیں گے یہ واضح رہے کہ آپ کی محبت پابند وصال کبھی نہ ہوگی۔"

زیدی۔ ہاں میں چاہتا ہوں کہ کوئی "محبت خیز" ہستی مجھے مل جائے اور اپنی زندگی آئین وفا کی پابندیوں میں گزار دوں

حسنین جو ابھی تک ہماری گفتگو کو نیم تبسّم کیساتھ سن رہا تھا بولا "زیدی تم کس خواب پریشاں میں مبتلا ہو، محبت سے اگر خواہش وصال سلب کر لی جائے تو پھر باقی کیا رہا، محبت کبھی قائم و دائم نہیں ہو سکتی یہ ہمیشہ موسمی لے ہوا کرتی ہے وفا کے ذکر سے مجھے ہنسی آتی ہے، وفا

نام ہے ایک باہمی غلط فہمی کا جو مدتوں سے عورت اور مرد کے درمیان چلی آرہی ہے، غالب نے خوب کہا ہے ؎

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلّی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

آپ کو اگر وفا کی تلاش ہے تو کسی دوسری دنیا میں جا کر ڈھونڈیے۔"

زیدی (حقارت کے لہجہ میں) پھر آپ سے اپنے خیالات کا اظہار کرنا ہی تضیع اوقات ہے۔ معاف کیجئے گا اس شعر میں بھی تو وفا کی تعریف آپ ہی جیسی مبارک شخصیتوں کے نقطۂ نظر سے کی گئی ہے کچھ شاعر نے اپنا فلسفۂ وفا تو بیان نہیں کیا ہے۔ وفا کی بابت اس کی ذاتی رائے تو اس کے ذہن میں محفوظ ہے، وہ تو دنیا کے سامنے اپنا شکوہ پیش کر رہا ہے لیکن میں لفظ "وفا" کو "شرمندۂ معنی" بنا کر دکھا دینا چاہتا ہوں ــــ (پھر حسنین کو اٹھتا ہوا دیکھ کر) ذرا ٹھہر جائیے، آپ نے جو کچھ فرمایا اس سے نہ صرف نسوانی غرور کی شکست ہوتی ہے بلکہ مردانہ وقار بھی پامال ہوا جاتا ہے آپ نے جس اصول کی اشاعت میرے سامنے کی ہے۔ وہ کوئی آپ کی

اجتہادی غلطی نہیں ہے عامیانہ طبقہ کے لوگ ایسا کرتے ہیں آپ
میں اور ان میں فرق یہ ہے کہ وہ ایسا کرتے تو ضرور ہیں مگر علانیہ
اس قسم کے افعال کو سراہتے نہیں اور آپ ان کو سراہتے ہی نہیں
بلکہ ان کی تبلیغ بھی کرتے رہتے ہیں۔ آپ کا ایک مضمون "فلسفۂ
شباب" کے عنوان سے میں نے کسی اردو رسالہ میں دیکھا ہے
اس کے ساتھ اڈیٹر صاحب کا ایک تعریفی نوٹ بھی تھا۔ ماشاءاللہ
آپ اپنے رنگ میں خوب لکھتے ہیں۔ آپ کی زبان پر تو
مجھے رشک آتا ہے۔ لیکن بُرا نہ مانئے گا آپ نے حقیقتوں کا خون
کر ڈالنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ "فلسفۂ
شباب" نے خدا جانے کتنے خام کار نوجوانوں کو "زندہ دوزخی"
بنا دیا ہوگا۔ حسنین صاحب آپ ہر شخص کو خواہ مخواہ اس کا
یقین دلانا کیوں چاہتے ہیں کہ دن تاریک ہوتا ہے اور رات۔۔
روشن؟ اس بات کو تو وہی تسلیم کر سکتا ہے جو دوسرے کی
آنکھوں سے دیکھنے کا عادی ہو اور جس نے اپنی بصارت سے
کام لینا چھوڑ دیا ہو۔"

حسنین جو نفسانیت کا غلام تھا زیدی کے اندازِ تکلّم سے
بیحد خفیف ہوا اور کچھ عذر پیش کر کے چلا گیا اس کے چلے جانے

کے بعد زیدی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہی لوگ ہیں جو دنیا کو اس کے متعینہ لطف العین سے دور لئے جا رہے ہیں۔ آج حسنین جیسی بے حمیت ہستیوں سے دنیا پاک ہو جائے تو میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ فردوس اگر کہیں ایسی دلفریب چیز کا وجود ہے ـــــ اپنی جگہ منتقل کر کے روئے زمین پر آجائے اور کوئی اس کی لذت سے محروم نہ رہے۔

میں۔ زیدی تمھاری باتیں پیاری تو بہت معلوم ہوتی ہیں لیکن ہم لوگوں کی سمجھ سے بعید ہیں کاش کہ تمھاری زنجیر حیات کی ایک درمیانی کڑی نابود نہ ہوتی یعنی تم کسی عورت کے پجاری نہ بن سکتے۔

زیدی۔ (متانت سے) خاموشی کے ساتھ اس ساعت کا انتظار کرو جبکہ میں کسی عورت سے محبت کرنے لگوں اور تمھیں حیرت میں ڈال سکوں۔

(۲)

زمانہ میں انقلابات کچھ اس سرعت کے ساتھ ہوا کرتے ہیں کہ ان کا تدارک محال ہوتا ہے اور مستقبل اس قدر تاریکی میں ہوتا ہے کہ اس کے متعلق نہ تو کوئی امید بیشتر

سے قائم کی جا سکتی ہے۔ اور نہ کوئی تدبیر مدافعت سوچی جا سکتی ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ زیدی میں جو نمایاں تغیر ہو رہا تھا وہ باوجود اس حد تک امید افزا ہونے کے ہلاکت و بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

علیگڈھ سے ہم دونوں نے ایم۔ اے پاس کیا۔ زیدی چونکہ اوّل آیا تھا اس لئے اس کو فوراً اس کے وطن لکھنؤ میں "نفسیات" کی پروفیسری مل گئی اور میں ایک خدمت پر مامور ہو کر حیدرآباد چلا گیا۔

ہم کو جدا ہوئے پورے دو برس ہوگئے اس دوران میں میرے اور اس کے درمیان برابر مراسلت ہوتی رہی، مگر جیسا کہ اس کی عادت تھی وہ تحریر میں ہمیشہ اختصار سے کام لیتا۔ اسلئے فراق کا زمانہ طرح طرح کی بےچینیوں میں گزرتا تھا ایک دن اسکا ایک کارڈ موصول ہوا۔ جس نے مجھے اس سے ملنے کیلئے بےچین کردیا۔ خط کا مضمون یہ تھا:۔

"ڈیر لقمان۔ اگر تم میری زندگی کا وہ نیا دور جس کے تم ہمیشہ متمنی تھے دیکھنا چاہتے ہو تو مجھ سے جلد ملو۔" "تمھارا زیدی"

میں نے فوراً اتفاقیہ رخصت کی درخواست دی جس کے منظور ہو جانے میں کچھ زیادہ دقت نہ ہوئی، ایک ہفتہ بعد لکھنؤ کے لئے روانہ ہو گیا، راستہ بھر برابر یہی سوچتا رہا کہ "آخر وہ نیا دور کیا ہوگا؟ کیا زیدی کسی کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ لیکن وہ تو کسی کی محبت نہیں کر سکتا، وہ تو ایک آلۂ خودرو (Automotion) ہے اور وہ اپنی محدود نوعیت کے خلاف کسی قسم کی زندگی نہیں بسر کر سکتا، ممکن ہے اس کا شعور اس کو دھوکہ دے رہا ہو، اور وہ ایک وقتی احساس کو ایک موسمی کیفیت کو محبت سے تعبیر کرنے لگا ہو۔"

لیکن لکھنؤ پہنچ کر مجھے معلوم ہو گیا کہ زیدی اب وہ زیدی نہیں رہا، اس کے بشرہ سے عزم و استقلال کے نہ مٹنے والے آثار نمایاں تھے، وہ تلوّن جو کبھی اس کا خاصۂ فطری تھا فنا ہو چکا تھا۔ بیشک اس میں اب وہ مختص النوع اضطراب باقی نہ تھا، اس کا التہاب ایک مرکز کی طرف مائل ہو چکا تھا اس کی سیمابیت اپنا خاص موضوع اختیار کر چکی تھی، جذبات نیاز و ذوق نیائش نے اس کے اندر ایک ہلچل مچا رکھی تھی اس لیے اس نے ایک خاص سمت کو اپنی سجدہ گاہ مقرر کر لیا تھا۔

اس سے پیشتر وہ ایک سفید و سادہ پھول تھا، مگر "محبت کے دیوتا" نے اس کی بیباک سفیدی اور شوخ سادگی کو آخر کار اپنے ایک "تیر آتشیں" سے یاقوتی رنگ میں رنگ دیا۔

زیدی میں اقتضائے سن بھی باقی نہ رہ گیا یوں تو وہ حسن کو برہنہ اور برافگندہ نقاب دیکھنے کا کبھی عادی نہ تھا، شاہدان بازاری سے وہ ہمیشہ نفرت کرتا رہا۔ وہ عورتیں جو مغربی تعلیم و تربیت سے بہرہ اندوز ہوتی ہیں زیدی کے لئے کبھی بھی سامانِ آزمائش مہیا نہ کر سکی تھیں تاہم کبھی کبھی ہم لوگوں کے ساتھ رقص و سرور کی محفلوں میں شریک ہو جایا کرتا یا آزاد خیال تعلیم یافتہ ہندوستانی اور یوربین عورتیں جب اسے دعوتیں دیتیں تو وہ رد نہ کرتا۔ زیدی ایک فصیح مقرر اور بے مثل مضمون نگار تھا۔ انگریزی اور اردو دونوں اس کی مادری زبان معلوم ہوتی تھیں چنانچہ اکثر رنگین مزاج یوربین لیڈیاں اور نیز وہ ہندوستانی عورتیں جو تہذیب مغرب کے جنون میں اپنی معاشرت سے بیگانہ ہو جاتی ہیں زیدی سے برابر ملتی رہتیں اور اس کی ہر ہر بات پر قربان ہونے کو تیار رہتیں وہ ان تمام عورتوں کو ہمیشہ قابل

ملامت تصور کرتا مگر اب تو اس نے گاہے ماہے ملنا بھی ترک کر دیا تھا

لکھنؤ آنے کے بعد ایک مرتبہ میں نے اس سے کہا "چلو آج کی شب تھیٹر دیکھ آئیں" مگر اس نے صاف انکار کیا کوئی علت میری سمجھ میں نہ آئی، بعد کو معلوم ہوا کہ (اسی کی زبان میں) بارگاہ ملکوت کی ایک "حسین مطربہ" اس کو نوید طرب دے رہی تھی۔ پھر تھیٹر یا کسی محفل رقص و سرور میں وہ کیوں شریک ہونے لگا۔

بہرکیف میں نے لکھنؤ پہنچنے کے ساتھ ہی زیدی سے پوچھا "تم نے خط میں جس نئے "دورِ حیات" کا تذکرہ کیا تھا اور جس کا اب میری آنکھیں مشاہدہ کر رہی ہیں اس کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟

زیدی۔ صوفیہ ....!

(اتنا کہتے کہتے اس کے ہونٹ کانپ گئے اور میں تصویرِ حیرت بنگیا)

زیدی۔ (سلسلہ کو قائم رکھنے کے لئے) صوفیہ بنت عم جس کو اس سے پیشتر نہ میں نے دیکھا تھا اور نہ تم نے۔ اس کے والد آج بیس برس سے مائی سور میں ملازم تھے۔ صوفیہ وہیں پیدا ہوئی اور وہیں اس نے تعلیم و تربیت پائی، اب اس کے والد استعفاء دے کر یہاں آگئے ہیں اور یہاں ہی رہیں گے۔

مجھے وہم بھی نہ تھا کہ میں اتنا جلد کامیاب ہوجاؤنگا۔ میرے عزیز دوست میں اپنا "درمقصود پاگیا"

اس کا چہرہ فرطِ مسرت سے گلابی ہوگیا وہ اور کچھ نہ کہہ سکا اور میں نے یہ محسوس کرلیا کہ محبت کا تصور ہی دورانِ خون میں ہیجان پیدا کرکے اعصاب و جوارح کو معطل کردینے کو کافی ہے پھر زبیدی نے البم سے ایک تصویر نکال کر مجھے دی اور کہا "لو یہ دیکھو تم جب اندر جاؤ گے تو آپ ہی معلوم کرلوگے کہ میرے "افسانۂ حیات" کا پلاٹ کس نے بدل دیا"

میں اندر گیا اور صوفیہ کے شرماتے ہوئے حسن کا غور سے معائنہ کرنے لگا، حسن ضرور تھا لیکن غیر معمولی نہیں ایک سترہ اٹھارہ برس کی دوشیزہ شبنمی لباس میں بیٹھی تھی، بال لانبے تھے۔ آنکھیں بڑی اور خوبصورت تھیں جن سے قدرے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس کے حسن ظاہری کا سرمایہ بس اس قدر تھا۔ خدا جانے کتنی عورتیں صوفیہ سے کہیں زیادہ حسین زبیدی کی نظر سے گزری ہونگی مگر اس کے جذبات کو ابھی تک کوئی بھی اُبھار نہ سکی، کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے اور اسی بنا پر اہل یونان کیوپڈ کی تصویر اندھی ہی پیش کرتے ہیں

کیا یہ حقیقت ہے؟ اس کا ہم اور آپ اگر جواب دیں تو بے انصافی ہوگی، کسی "خراب کردہ محبت" سے دریافت کیجئے:-

نزاگاہے گریبانے نہ شد چاک
چہ دانی لذّتِ دیوانگی را

بعض لوگ محبت کو "بچپن" سے تشبیہ دیتے ہیں کیونکہ انسان اس کی وجہ سے انتخاب کے موقع پر اکثر دھوکا کھا جایا کرتا ہے، یعنی اس کی صحیح قوت فیصلہ زائل ہوجاتی ہے اور وہ یا تو سطح عام سے بہت بلند "اعلیٰ علیین" کی طرف پرواز کرنے لگتا ہے یا "اسفل السافلین" کی جانب مائل ہوجاتا ہے، یا شاید محبت میں یہ بھی قابلیت ہوتی ہے کہ وہ معمولی سے معمولی منظر کو حسین ترین بنا کر دکھا دے کیا یہ سب خیالات صحیح ہیں؟ زیدی سے آپ پوچھتے تو وہ ہنس دیتا اور کہتا کہ "یہ سب روایات شاعری یا خرافات ادبی ہیں۔"

جب میں باہر آیا تو زیدی نے پوچھا "تم نے اس سفید ہرنی کو دیکھا" میں اسے وحشت کی دیوی کہا کرتا ہوں۔

میں۔ یہ صوفیہ حسین ضرور ہے مگر کیا اسقدر کہ ایک انقلاب پیدا کر سکے؟ کیا اسمیں کوئی باطنی وصف ایسا ہے؟

زیدی۔(میری جارحانہ تنقید سے مکدر ہوکر) مجھے "ظاہری" اور "باطنی" کی لغو تفریق سے تم جانتے ہو کتنی چڑھ ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حسن نسائیات کا معیار تم نے کیا رکھا ہے؟ عورت میں بس بے شعوری اور سادگی وجدانیت اور معصومیت ہونی چاہیئے، پھر وہ اپنی فتوحات کی آپ ضامن ہے۔ اس کے علاوہ صوفیہ اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم حاصل کر چکی ہے۔ وہ شریف ہے، حقیقی معنوں میں شریف، میں نے بارہا اس کو اپنی اسس شرافت کے ہاتھوں نقصان اٹھاتے دیکھا ہے۔ اور مجھے مسرت ہوئی، اس کا سینہ صداقت و عصمت سے اس طرح معمور ہے کہ مجھے یقین ہے اس سے کبھی کوئی نسوانی لغزش ممکن ہی نہیں۔ وہ رشک وحسد جانتی ہی نہیں میں اسکی زیادہ تعریف نہیں کر سکتا، تعریف کو میں بازاری فعل سمجھتا ہوں، اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میں صوفیہ کی محبت کرتا ہوں اس لئے اس کو تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔

میں۔(ہنسکر) تو جو اس قدر شریف یا دوسرے الفاظ میں اس قدر بیوقوف ہو کہ آپ ہی اپنا نقصان کر سکے اسی کی آپ محبت کرینگے؟ زیدی کار زار حیات میں ہمکو ایسا کرنے کی

اجازت نہیں ملی ہے۔

زیدی ۔ نقصان کا لفظ میں نے دنیا کے نقطۂ خیال سے استعمال کیا ہے ورنہ شرافت سے کبھی نقصان نہیں ہوا تھا۔ تم خوب جانتے ہو کہ میں صرف ضمیر کی خوشی کو فائدہ اور اس کے متکرلہ کو نقصان تصور کرتا ہوں، لغماں کارزار حیات کا نام نہ لو یہ ایک عامیانہ لفظ ہے۔ اور خوئے بد کے لئے ایک زبردست "بہانہ" ہی نہیں بلکہ یہ ایک ایسی مہمل اصطلاح ہے۔ جس کا کوئی خاص مفہوم خود تمہارے بھی ذہن میں نہیں ہے میرے نزدیک تو "جہد للبقا" کے میدان میں ایسی کامیابی ممنوع ہے۔ جو روح کو مجروح اور ضمیر کو کند کر دے۔ تم نے بڑی عنایت کی کہ "شرافت" اور بیوقوفی" کو ایک ہی چیز سمجھ کر میری مسرتوں کو چھین لینا چاہا! تم سے اور تمہاری دنیا سے اسکی توقع ہو سکتی ہے۔

میں۔ (پشیمان ہوکر) میں نے تو مذاق میں ایسا کہا تھا۔

زیدی۔ ہر بات کا ایک موقع اور ہر چیز کا ایک محل ہوا کرتا ہے ایسی حالت میں مذاق کرنے کی کون سی وجہ آپ بتا سکتے ہیں جبکہ ابتدا سے آپ سنجیدگی سے سوال کرتے جا رہے ہیں۔ اور میں اس سے کہیں زیادہ سنجیدگی سے جواب دیتا جاتا ہوں،

میں۔ اچھا میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں، خدا کے لئے ناراض نہ ہو، مجھے معاف کردو۔

زیدی۔ میں ناراض نہیں ہوا کرتا، لیکن تم کو یہ صلاح دیتا ہوں کہ دنیا کے ہر واقعہ کو خالی الذہن ہوکر دیکھو، غور کرو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔

اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ زیدی دنیائے فکر میں ایک خاص تغیر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ بڑے جوش و خروش سے اخلاقیات اور روحانیت کی تبلیغ کررہا تھا، وہ ایک ایسی تہذیب دنیا میں پھیلانا چاہتا تھا جو انصاف اور مساوات پر مبنی ہو۔

قوت ارادی کی بابت اس کا مجتہدانہ نظریہ اس کو دیوانہ سمجھنے پر مجبور کرتا تھا۔ اس کا اعتقاد تھا اور وہ دوسروں کو بھی اس کا معتقد بنانا چاہتا تھا۔ کہ قوت ارادی اگر درجۂ کمال کو پہنچ جائے تو انسان اڑ بھی سکتا ہے وہ یہ بھی کہتا تھا کہ اس وقت اس کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ اپنی تمام توجہ کسی ایک چیز پر وقف کردی جائے، چنانچہ "محبت" بھی اس کی تکمیل کا ایک کامیاب ذریعہ ہے۔

زیدی کا یہ ادعا میرے لئے چنداں تعجب کا باعث نہ، ہوا۔

اس نوع کی ہستیاں تو اکثر یہ دعوے کرنے لگتی ہیں کہ آسمان کی اخضریت زمین کی گردش اور شمس و قمر کی ضیا پاشی انھیں کی ذات اور انھیں کے خیالات کا پرتو ہے۔ ایک شام کو جبکہ ہم دریائے گومتی کے کنارے ٹہل رہے تھے، میں نے اس سے پوچھا "آخر محبت کا کوئی قابل تجدید مفہوم بھی تمھارے دماغ میں ہے؟ میرے خیال میں تو اب تک اس دنیا میں ایک کثیر تعداد محبت کرنے والوں کی گذر چکی ہے۔ تو کیا سب کے سب اڑ سکتے ہیں۔

زیدی۔ میں ایک بار سمجھا چکا کہ محبت کچھ اور شئے ہے اور نفسانیت کچھ اور خواہ مخواہ محبت جیسی پاک چیز کو بکیں عود تو کو دھوکا دینے کا عنوان کیوں بتاتے ہو، محبت کی تعریف و تعین تو دشوار ہے ہاں اتنا تمھیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس جذبہ لطیف کو قائم رکھنے کے لئے لازمی ہے کہ "مادیات" سے قطع نظر کر لیا جائے یہاں تک کہ ایک "تخیل مجرد" ایک "تصور مطلق" کے سوا کچھ رہ نہ جائے جو اسکی لطافت و نزہت کو آلودہ کر سکے" اب تک کثیر تعداد محبت کرنے والوں کی گزر چکی ہے؟ نہیں تو البتہ "پرستاران نفس" کثرت سے ہو چکے ہیں، محبت کبھی تسکین وصال کی محتاج نہیں ہوسکتی لیکن ان "دلدادگان لذیت"

میں سے کون ایسا تھا جو سو برس تک رونے پر خوشی سے آمادہ نہ ہوجاتا اگر اس طرح وصال محبوب میسّر ہوسکتا، میری یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ رونا کا ہے کا ہوا کرتا ہے، کسی حکیم کا قول ہے کہ "جس کی تم محبت کرتے ہو اس پر قابو پانے کی کوشش ہرگز مت کرو۔ ورنہ ساری مسرت برباد ہوجائیگی" یہ حقیقت ہے۔

میں۔ مگر حسن کو دیکھنے کے بعد غیر اختیاری طور پر یہ تمنا پیدا ہوجاتی ہے۔ کہ کسی طرح اس کو اپنا بنا لیجئے، تم پھول کیوں توڑ لیتے ہو؟

زیدی۔ میں پھولوں کو نہیں توڑتا میں تو ان کا احترام کرتا ہوں یہی سبب ہے کہ تم نے میرے ہاتھ میں ہار بہت کم دیکھا ہوگا، اور جب کسی دوست نے پھول یا ہار دیا ہے تو پژمردہ ہوجانے کے بعد میں نے اس کو نہایت احتیاط سے اپنے صندوق میں رکھ لیا ہے، تم مرجھائے ہوئے پھولوں کا مجموعہ میرے پاس دیکھتے ہو (یہ واقعہ تھا) وہ مجھے اس حالت میں بھی جسے تم لوگ پژمردگی سے تعبیر کرتے ہو اسی طرح حسین معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ عالم شگفتگی میں۔ حسن کی تخلیق سے خاطر عالم کا مقصد انسان میں احساس "جمال" پیدا کرتا تھا، اگر حسن کو دیکھکر تم اس

پر قابو پانا اور اس کو پامال کرنا چاہتے ہو تو یہ صریحاً عدوان ہے، ہاں یہ تمھارے اعصاب کا قصور ہے کہ وہ حسن اسے غلط ارتسامات قبول کرتے ہیں، گیٹے کہتا ہے "ہم کچھ ستاروں کے آرزو مند نہیں ہم کو تو ان کی نورانیت ہی مسرور کرتی ہے۔"

میں۔ مجھے بڑا تعجب ہو رہا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم زیدی ہو یا کوئی۔ اور.........!

زیدی۔ کائنات کا ہر ذرہ حادث و متغیر ہے اور حادثات و تغیرات لمحہ بہ لمحہ وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ نہ میں وہ زیدی ہوں جو اب سے دو سال پیشتر تھا اور نہ تم وہ نعمان یہ تو ایک موٹی سی بات ہے۔ میں تمھیں اور کیسے سمجھاؤں نعمان تمھاری نگاہیں بہت تنگ اور سطحی ہیں ورنہ تم قدم قدم پر متحیر نہ ہوتے دنیا میں کسی چیز کو ناممکن الوقوع نہ سمجھو، بہت ممکن ہے کہ تم جو اس وقت نہایت فصاحت و بلاغت سے گفتگو کر رہے ہو کل یکایک گونگے ہو جاؤ میں جو کسی واقعہ کو امکان سے باہر نہیں سمجھتا تمھاری زبان بند ہو جانے پر اتنا ششدر نہ ہونگا۔ جتنا تم میری اس تبدیلی پر ہو رہے ہو۔

میں۔ مگر مجھ میں تم کون سی تبدیلی بتا سکتے ہو۔ میں تو شاید

ذرا بھی نہیں بدلا۔

زبیدی۔ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم وہی نعمان ہو اگر اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ تم اب متاہل زندگی بسر کر رہے ہو۔

میں۔ اچھا اس بحث کو جانے دو۔ چند سوالات تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم صوفیہ سے شادی کرنا چاہتے ہو، یا محض اس کو دیکھتے رہنا اور اس کی تعریف کرتے رہنا اپنا نصب العین سمجھ رکھا ہے؟ فرض کرو کہ اس کی شادی کہیں اور ہو جائے اس وقت تم کیا کرو گے؟ کیا تمہاری زندگی تلخ نہ ہو جائے گی؟

زبیدی۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں "رہبانیت" کا موید نہیں ہوں، میں شادی کے صرف اس وقت خلاف ہوتا ہوں جب محبت اسکی محتاج قرار دیدی جاتی ہے، لاریب میں صوفیہ کے سیل حسن میں اپنی نگاہوں کو غرق رکھنا اور اسکی تعریف کرتے رہنا اپنا بہترین "وظیفۂ محبت" خیال کرتا ہوں اور میری محبت آرزوئے مناکحت سے مطلقاً بے نیاز ہے، تاہم مجھے کسی قدر خواہش ہے کہ میں اس کے ساتھ منسلک کر دیا جاؤں۔ اس واسطے کہ اس کے حسن کا صحیح مصرف اور اس کی سچی قدردانی میرے سوا کوئی نہیں جانتا، لیکن اگر صوفیہ میری نہیں ہو سکتی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ میں بھی

اس کا نہیں ہو سکتا۔ یعنی اگر وہ مجبوراً کسی دوسرے سے شادی کر لے تو اس حالت میں بھی میں اس کی محبت ہرگز ترک نہ کرونگا "مجبوراً" کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا کہ ہندوستان انتخاب زوجین کے لئے آزادی رائے کا حق ہم کو، خصوصاً عورتوں کو نہیں دیتا۔ یہی نہیں بلکہ یہاں کی پبلک کو محبت کرنیوالوں سے خاص ضد ہوجاتی ہے اور محب و محبوب کا اتصال خدا جانے کن اصول پر ناستودہ سمجھا جاتا ہے۔ ورنہ مجھے کامل یقین ہے کہ صوفیہ مجھے چھوڑ کر کسی اور کو اپنے جذبات کا مرکز بنانا گوارا نہیں کر سکتی۔

تم پوچھتے ہو کہ صوفیہ کی شادی کہیں اور ہوجائے تو تم کیا کرو گے؟ میں اس کے شوہر کے ساتھ جیسی محبت کروں گا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، میری سب سے پہلی کوشش یہ ہوگی کہ صوفیہ اپنے خاوند کے ساتھ خوشگوار زندگی بسر کر سکے، اور اپنے فرائض نسوانی کی طرف سے غافل نہ ہونے پائے مجھے پوری امید ہے کہ صوفیہ اگر مرتی بھی ہوگی تو بھی اپنے فرائض کی طرف سے پہلو تہی نہ کریگی۔ یہ بھی سن لو کہ صوفیہ کے ساتھ میرا کیا برتاؤ ہوگا میں اس سے شادی کے بعد بے تکلف ملنا یکقلم

بند کردوں گا۔ تاکہ میری طرف سے کوئی مغویانہ تحریک نہ ہو اور ایک لمحہ کے لئے بھی اس کو اپنے وظائف کی طرف سے بے اعتنا ہونے کا موقع نہ ملے۔ ہاں تم لوگوں کی نگاہوں سے اگر دیکھا جائے تو میری زندگی ایک حدتک تلخ ہوجائیگی۔ مگر میں اس تلخی کو شیرینی سے بدل سکتا ہوں، انبساط و الم کا وجود اضافی (Relative) ہے ایسی حالت میں اگر شیرینی کی لذت کو ہم کسی طرح سے بھول سکیں تو تلخی اور شیرینی مہمل تفریق مٹ جاتی ہے انسان اپنی ہی ذات سے جنّت کو دوزخ اور دوزخ کو جنت بنا سکتا ہے میں بھی اپنی دوزخ کو جنت بنالوں گا۔ اور وہ اس طرح کہ صوفیہ کی محبت میں محو ہو کر راحت و رنج کے امتیازی احساسات کھو بیٹھوں گا۔ لیکن ان تمام باتوں کا علم صوفیہ کو ہرگز نہ ہونے پائیگا۔

زیدی کے "نظریات محبت" کو سن کر میں خاموش ہورہا کچھ زیادہ بحث کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی، مجھے کسی کا قول یاد آگیا کہ وہ محبت ہی کی دنیا ہوتی ہے۔ جس کو ہماری قیاسی دنیا کسی مافوق الفطرت کشش کی تابع تصوّر کرنے پر مجبور ہے۔ غالب نے فلسفہ "بیحسی" کی تلقین ہی کی تھی مگر زیدی اس

پر عامل ہونے کو تیار تھا۔

۳

نیٹشے کہتا ہے "شریف ترین حسن وہ ہے جو یکایک ہم کو بے بس نہ کردے جس کے نتائج طوفان خیز اور نشہ آفریں نہ ہوں جو آہستہ آہستہ ہمارے ذہن میں اپنی گنجائش پیدا کرتا رہے جس کو ہم غیر شعوری طور پر قبول کرتے رہیں .... جو بہر حال ہمارے دلمیں ایک مدت تک خموشی کے ساتھ بس چکنے کے بعد ہم پر پورا اقتدار پالے اور (آخرکار) ہماری آنکھوں کو آنسوؤں سے ہمارے دلوں کو ایک درد تمنا سے لبریز کردے" زیدی نیٹشے کے اس خیال کی یوں تشریح کیا کرتا "وہ حسن جس سے ہم فوراً مغلوب ہو جاتے ہیں، عموماً بے مایہ ہوتا ہے اور اپنے اثرات زیادہ عرصہ تک قائم رکھنے سے قاصر رہ جاتا ہے، لیکن وہ حسن جو رفتہ رفتہ اپنا نقش جماتا رہتا ہے ایک متاع کثیر اپنے اندر رکھتا ہے اور اس لئے اپنے "ارتسامات" عمر بھر کامیابی کے ساتھ قائم رکھ سکتا ہے" یہ تھا زیدی کا نظریۂ "جمالیات" جب کبھی وہ ناول میں پڑھتا کہ فلاں مرد نے فلاں حسین عورت کو دیکھا اور وہیں کلیجہ تھام کر بیٹھ گیا، تو اسے

حیرت ہوتی۔

وہاج الدین صاحب کی لڑکی۔ زیدی کی "فردوسی تیتری" یعنی صوفیہ کا حسن بھی اسی نوع کا تھا۔ وہ ایک آفتاب تھی جس نے دھیرے دھیرے اپنی دھوپ تمام سرزمین لکھنو پر پھیلادی، لکھنو کے ہر برآوردہ شریف خاندانوں میں اس کا تذکرہ ہونے لگا۔ کون تھا جو اس کو اپنا "چراغ خانہ" بنانے کا آرزومند نہ ہوا ہو، پیغام ازدواج اکثر جگہوں سے آیا مگر صوفیہ کے والد نے نہایت دشوارپسند طبیعت پائی تھی۔ اس لئے کوئی شخص اپنے پیام میں اب تک کامراں نہ ہو سکا......!

حیدرآباد کی زندگی میرے لئے وبال تھی۔ وطن (لکھنو) کی آب وہوا سے محروم اور زیدی کے رومان حیات سے بے خبر رہنا مجھے بیحد ناگوار تھا۔ خوش قسمتی سے حیدرآباد کو الوداع کہنے کا موقع بھی بہت جلد مل گیا۔ مارچ کا شروع مہینہ تھا موسم بدل رہا تھا۔ میں یکایک میعادی بخار میں مبتلا ہو گیا اور تقریباً ایک ماہ تک نقل وحرکت سے بالکل معذور رہا، والدین نے خط پہ خط بھیجنے شروع کئے اور برابر یہی اصرار ہوتا رہا "کہ ملازمت سے استعفا دے کر وطن چلے آؤ" میں دل ہی دل میں

مسرور تھا کہ میری تمنا پوری ہوتی نظر آتی تھی جب کچھ قوت مجھ میں آگئی تو سب سے پہلا کام جو میں نے کیا وہ استعفا داخل کرنا تھا۔

اس طرح مجھے مستقل طور سے لکھنؤ میں زیدی کی مصاحبت نصیب ہوگئی ...... مگر زیدی میرے قرب سے چنداں خوش نہ ہوا۔ اس نے شناعت کے ساتھ مجھ سے کہا "یہ کیا نامردی تھی کہ صرف ایک ماہ تک تپ محرکہ کی تکلیف برداشت کرنی پڑی اور آپ استعفا دے کر یہاں بھاگ آئے، انسان کو اگر زندگی میں کامیاب رہنا ہے تو اس کو ہر قسم کی صعوبت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہونا چاہیئے، رہا یہ عذر کہ حیدرآباد میں میری معیت، عزیز و اقارب کی ہمدردی اور لکھنؤ کی روح پرور فضا میسر نہ تھی، سو میرے نزدیک تو صرف تمہارا خیال تھا۔ جس کو اپنے ذہن سے تم بہ آسانی دور کر سکتے تھے۔"

میں۔ خیر آپ کے لکچر کی ضرورت نہیں

زیدی۔ (ترشی کے ساتھ ہنس کر) اور اسی وجہ سے میں لکچر دے رہا ہوں، آپ میرا لکچر سننا نہیں چاہتے؟ یہ دلیل اس بات کی ہے کہ آپ اپنے نفس پر ذرا بھی جبر گوارا نہیں کر سکتے

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ جس نے سب سے پہلے لکھنؤ میں میری مدد کی زیدی ہی تھا۔ میرے لئے کسی ایسے مشغلہ کی ضرورت تھی جس کے ذریعہ سے میں اپنی اور اپنے متعلقین کی کفالت کرسکتا۔ زیدی نے کوشش بسیار کے بعد مجھے کالج میں ''اقتصادیات'' کی پروفیسری دلادی اب تو میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی لکھنؤ میں میرا مکان اس کے مکان سے ملحق تھا اس لئے شب و روز کا بیشتر حصہ میں زیدی ہی کی ہمراہی میں گزارنے لگا۔

میں نے صوفیہ کی بابت اس سے قبل اس کو پہلی مرتبہ دیکھکر یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "حسن ضرور تھا مگر غیر معمولی نہیں'' اب ندامت کے ساتھ ان الفاظ کو واپس لیتا ہوں جو مجھ پر میری نادانی اور بددانی ثابت کررہے ہیں۔ صوفیہ حسین ہے۔ اور ''غیر معمولی'' حسین (اگر ہماری مادی و ظاہر پرست دنیا حسن میں تناسب اعضا کے علاوہ غیر مادی عناصر بھی شامل کرنا گوارا کرے) لازمہ حسن نیٹشے کے خیال کے مطابق یہ ہے کہ وہ دفعتہً" ہماری نگاہوں کو خیرہ نہ کردے بلکہ رفتہ رفتہ ہم کو اپنے تاثرات میں جذب کرلے، صوفیہ جیسا کہ پہلے

بتایا جا چکا ہے اس تخیل دلربائی کی ایک زندہ تصویر تھی حسن صورت کے ساتھ ساتھ حسن سیرت میں بھی وہ آپ اپنی نظیر تھی۔ عہد عتیق کے نازک خیال یونانیوں کے درمیان اگر وہ پیدا ہوئی ہوتی تو وہ یقیناً اس کو کوئی نہ کوئی دیوی تسلیم کر کے موضوع پرستش قرار دیدیتے (اور غالباً وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہوتے) صوفیہ نے مجھے اس طرح اپنا شیدائی بنا لیا کہ بعض اوقات چند لمحوں کے لئے مجھ کو یہ خوف ستانے لگتا کہ کہیں میں بھی اس کا عاشق تو نہیں ہو گیا لیکن پھر اپنی ٹھوس طبیعت سے میری تسکین ہو جاتی اور مجھے یاد آجاتا کہ تقسیم عام کے وقت قسام ازل کی بارگاہ میں میں ذرا تاخیر کر کے پہنچا تھا، اور اس لئے اس عطیۂ ازلی سے قطعی بے بہرہ رہا۔ البتہ کمی کو پورا کرنے کے شوق میں عشق نما نفس پرستی کرنے کا کئی بار اتفاق ہوا، یہاں تک کہ انجام کار میرے حواس درست ہو گئے "کار بوزینہ نیست بنجاری" کا راز مجھ پر منکشف ہو گیا اور میں نے اس "اعتراف ہزیمت" کا بدترین پہلو اختیار کر لیا یعنی شادی کر کے گھر بیٹھ رہا۔"

میں یہ بتانا بھول گیا کہ میرے افسانہ کا ہیرو "الھتہ المنیٰ"

کا پرستار تھا، یعنی وہ نغمۂ موسیقی کے ساتھ ایک خاص شغف رکھتا تھا اور قدرت نے اسے اسی تشنگیٔ ذوق کو بجھانے کے لئے اسے ایسی شیریں آواز عطا کی تھی کہ سننے والے بیتاب ہوجاتے ہیں تو اس کی نوائے شیریں کو چوم لینا چاہتا مگر حیف کہ ناکام رہ جاتا۔ اس کے اہتزازات نغمہ کو پکڑ لینا چاہتا لیکن افسوس کہ وہ ہماری دسترس سے باہر ہو جاتے۔

طرب و موسیقی کے متعلق بھی زیدی کے خیالات ندرت وغرابت سے خالی نہ تھے وہ بجز بانسری کے تمام سازہائے طرب سے نفرت کرتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ "یہ سازہائے طرب موسیقیت کو کراہیت سے بدل دیتے ہیں" موسیقی کی تعریف وہ یوں کیا کرتا "الوہیت مائل بہ النسانیت ہے اور النسانیت مائل بہ الوہیت دونوں کے تصادم سے جو لطیف ارتعاش پیدا ہوتا ہے وہی موسیقی ہے" رابندر ناتھ ٹیگور کا خیال بھی قریب قریب یہی ہے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ زیدی اپنے کمرے میں پیانو پر بیٹھا ہوا تھا سامنے ایک کرسی پر میں بیٹھا تھا اور دوسری کرسی پر ابوالفرح ایزدی جو کیننگ کالج میں انگریزی کا پروفیسر تھا اس کمرے سے متصل ہی ایک اور بڑا کمرہ تھا۔ جو غمو ماً

عورتوں کے تصرف میں رہتا تھا۔ زیدی مختلف غزلوں کو گاتا ہوا مرزا بیدل کے ان اشعار کو گانے لگا:۔

بسے کز گفتگو خوں شد لوائے ساز من دارد
بہر جا خامشی بینی زبانِ راز من دارد
شکست رنگ جرات می کشاید بال اظہارم
تپیدن ہائے بسمل شوخیٔ آواز من دارد

آپ یقین مانئے میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ قریب و دور کی ہر چیز جل اٹھی ہے۔ خود زیدی اس وقت اس معدوم الوجود طائر سے مشابہت رکھتا تھا، جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اپنی لوائے آتشیں سے چنگاریاں پیدا کر کے اپنے آپ کو نذر آتش کر دیتا ہے معلوم ہوتا تھا کہ زیدی آج کے گانے کے بعد پھر کبھی نغمہ پیرا نہ ہو سکے گا معاً پاس کے کمرے سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی ایک نازک آہ سنائی دی، یہ کیا تھا؟ کچھ نہ پوچھئے۔

صوفیہ آج اپنی بڑی کمزوری سے آگاہ ہوگئی جس کو اس کی کوشش اخفا کے باوجود میں نے اور شاید میرے معصوم زیدی نے بھی سمجھ لیا۔ وہ کسی ضرورت سے اُس

کمرے میں آئی تھی، زیدی کو گاتا ہوا سن کر رک گئی اور موسیقی کے "طلسمی نشیب و فراز" میں بالکل کھوگئی، یکایک ایک خیال آیا کہ اب اس کو واپس جانا چاہیئے لیکن زیدی کے دلنواز ترانے اس کے اعصاب کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے، اسی انتشار کیفیات میں پلٹی ہی تھی کہ کسی چیز کی ٹکر کھا کر گر پڑی ہاتھ میں شربت کی بوتل تھی جو ٹوٹ کر اسکے ساعد سیمیں چُبھ گئی، اور اس کے منہ سے ایک بے ساختہ آہ نکل گئی۔ زیدی اس آشنا آواز کو سن کر چونک پڑا، اور دوڑ کر اندر پہنچا، میں بھی اس کے ساتھ دوڑا، اس عرصہ میں تمام عورتیں اس کمرہ میں جمع ہو چکی تھی اس لئے میں اور زیدی واقعات کو دریافت کر کے اپنی نشست گاہ میں واپس آئے۔ اور صوفیہ چند لمحوں کے لئے بے حس و حرکت پڑی رہی، جب ہوش میں آئی تو غالباً افشائے راز کے خوف سے اس نے اپنے گرنے کی وجہ یہ بتائی کہ "میں بوتل ہاتھ میں لئے اس کمرہ میں شیشہ کا گلاس لینے کی غرض سے آئی۔ چونکہ یکبارگی روشنی سے تاریکی میں آئی تھی اس لئے میری آنکھیں کام نہ کر سکیں اور میں ٹھوکر کھا کر گر پڑی" مگر اس کی ماں نے کہا "تم کو اس کمرے میں آئے ہوئے

دیر ہوئی اور تمہارے گرنے کی آواز ابھی سنائی دی ہے" صوفیہ اس تردید سے کچھ پریشان سی ہوگئی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اسی تردید نے میرے اس قیاس کو مستحکم کردیا کہ وہ زیدی کا گانا سننے میں محو تھی اور اپنے کو بھول گئی تھی لیکن کسی اور کا خیال اس کے گانے کی طرف نہیں گیا۔

زیدی جب اندر سے واپس آیا تو اس کا چہرہ اس کے تاثرات کا بہت کچھ پتہ دے رہا تھا مگر وہ اپنے جذبات مضطرب کو چھپانے کی برابر کوشش کرتا رہا، بزم طرب جب برہم ہوئی اور ابوالفرح اپنے گھر جانے لگا تو اس نے اس کو اس طرح رخصت کیا گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا، اس نے ابوالفرح سے کہا "کل آپ دن کا کھانا میرے مکان پر کھائیں گے اور پانچ بجے شام تک یہیں رہینگے اس کے بعد ہم اور آپ کالج چل کر محفل تقریر میں شریک ہونگے، میں نے اپنے "بحث" پر کافی غور نہیں کیا ہے امید ہے کہ رات بھر میں کل کے لکچر کے لئے تیار ہو جاؤں گا۔ مس مہروان جی کے متعلق اب تک میں نے کوئی رائے نہیں قائم کی ہے جس سے آپ کو مطلع کردوں، ان کا لکچر سن لوں ان کے حرکات و سکنات سے آشنا

ہولوں تو شاید ان پر کوئی تنقید کرسکوں۔ مجھے تعصب سے عناد ہے اس لئے قبل از وقت اپنی رائے آپ کے سامنے ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔

ابوالفرح "بہتر ہے" کہکر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد زیدی تھوڑی دیر کے لئے عالم جمود میں تھا' میں اس کے واردات قلبی سے بے خبر نہ تھا۔ تاہم سلسلۂ سکوت کو توڑنے کی غرض سے میں نے پوچھا "صوفیہ کے گرنے کی بابت تمھارا کیا خیال ہے؟"
زیدی۔ یہی کہ وہ کسی چیز سے ٹکرا کر گر پڑی۔
میں۔ زیدی تم مجھے دھوکہ دینے کی لاحاصل کوشش مت کرو کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ صوفیہ کو تمھاری اثر آفرینیوں نے بلے خود نباد یا تھا؟۔
زیدی۔ دو ایک بار مجھے ایسا گمان ضرور ہوچکا ہے' لیکن اس گمان کو زیادہ مضبوط بناکر اپنی لذتوں کو برباد کرنا نہیں چاہتا نعمان خدا کے لئے مجھے اس کا یقین نہ دلاؤ کہ صوفیہ کا گرنا اس کے جذبات محبت سے تعلق رکھتا ہے۔ ورنہ میرے دل میں اضمحلال و افسردگی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے' دیکھو آسکر وائلڈ (oscar wilde) کہتا ہے "رومانیت کی روح اشتباہ ہے"

کتنی میٹھی بات کہی ہے، طرفین کو جب باہمی محبت کا یقین ہو گیا تو تمھیں بتاؤ کہ محبت کی دنیا میں رہ کیا گیا جس کے لئے زندہ رہنے کی تمنا کی جائے، ایسی حالت میں دونوں کا مرجانا زیادہ مستحسن ہے کہ اس طرح کیف و سرور تو عمر بھر باقی رہا، علاوہ اس کے عورت جب اپنے لطیف محسوسات کا اظہار کر دیتی ہے تو پھر اس میں کوئی رنگینی کوئی دلفریبی نہیں رہ جاتی، کم از کم مجھے تو ایسی عورت سے نفرت ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مجھے عورتوں کی شاعری گوارا نہیں۔ موسیقی کی طرح جنس نازک کو بھی اپنا راز کبھی آشکارا کرنا نہیں چاہیئے۔ اناث میں صرف اتنی ادبیت چاہتا ہوں کہ وہ مردوں کے حسیات و نفسیات کو بخوبی سمجھ لیں، لیکن ان کو اپنے جذبات و کیفیات ہمیشہ اپنے اندر ہی دفن رکھنا چاہیئے۔

میں۔ (حیران ہوکر) تم کیسی مجرالعقول باتیں کر رہے ہو۔ کیا مجھ سے یہ کہنا چاہتے ہو کہ صوفیہ نے تم سے اب تک اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا ہے؟

زیدی۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے بھی صوفیہ سے اپنی محبت کا اقرار ابھی تک نہیں کیا ہے۔

میں۔ پھر تمھیں یہ توقع کیسے ہوئی کہ صوفیہ تم کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنے جذبات کا مرکز بنانا گوارا نہیں کر سکتی؟

نیدی۔ محض قیاس کی بنا پر اور بہت ممکن ہے میرا قیاس درست ہو۔

میں۔ پھر جب تم لوگوں نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے راز سے واقف نہیں کیا ہے، تو تمھاری یہ خواہش کیسے پوری ہو سکتی ہے، کہ تم اس کے ساتھ منسلک کر دیئے جاؤ؟

نیدی۔ میں نے اپنا یہ خیال بھی بدل دیا ہے "تحریک ازدواج میں کوئی رومانیت ہی نہیں"

میں۔(پیچ و تاب کھاکر) للّٰہ ہوش میں آؤ" کیا تم دل سے یہ دعا نہیں کر رہے ہو کہ صوفیہ تمھاری بیوی ہو جائے؟

نیدی۔(پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہو کر) مطلقاً" نہیں۔ دعا کرنا اپنے نفس کی توہین ہے، مجھے یاد ہی نہیں کہ میں نے کبھی کوئی دعا کی ہو۔۔ البتہ پہلے کچھ خواہش تھی، کہ صوفیہ میری ہو کر رہے، اب اتنی خواہش بھی نہیں ہے، اسکی وجہ اس کے سوائے اور کیا بتاؤں کہ میرا ذہن زیادہ رسا ہو گیا ہے، میرا نفس زیادہ ترقی کر چکا ہے اور میں نے اس وجدانی

خزاں کو پہلے سے سمجھ لیا جو اس منافقت سے پیدا ہونیوالا تھا۔

زیدی کو عموماً لوگ مغرور کہا کرتے تھے، میں اس کے غرور کو خود داری اور عزت نفس پر محمول کیا کرتا مگر اب اس کی خود داری بادی النظر میں حد سے متجاوز ہو چلی، وہ دعا کرنا بھی اپنی اہانت سمجھنے لگا تھا، ربما یہ مجھے ناگوار گزرا، لیکن اسکی ایک ایک بات حقیقت سے اتنی قریب ہوتی تھی کہ مجھے یقین ہے کہ بڑے سے بڑے منافق کو بھی وہ اپنا موافق اور ہمخیال بنا لیتا، چنانچہ جب میں نے اس سے کہا کہ "اتنی انانیت بھی ٹھیک نہیں" تو اس نے یہ جواب دے کر مجھے خاموش کر دیا "یہی ایک صفت ہے ـــــ جس نے انسان کے آگے ملائک کو سربسجود کر دیا اگر انانیت نہ ہوتی تو نفس انسانی کی بے مائگی ظاہر تھی۔ نعمان کسی خیال سے صرف اس لئے اختلاف نہ کیا کرو کہ وہ "روایات عامہ" کی تنقیص کرتا ہے، دنیا میں بہتیرے خیالات ایسے رائج ہو گئے ہیں جو حقایق کو ہماری نظروں سے چھپائے ہوئے ہیں۔ انانیت کے معنی اگر تم غرور کے لو تو قطعی، گناہ ہے، لیکن اگر اس سے مراد احساس خودی ہے تو یہ الوہیت کا ایک شائبہ ہے۔ مجھ میں غرور ہرگز نہیں ہے۔

خودی کا احساس ضرور ہے۔ میں دعائیں اس وجہ سے نہیں مانگتا، کہ اگر قبول نہ ہوئیں تو جذبۂ خودداری کو ٹھیس لگتی ہے اور دعا مانگنے کی حاجت ہی کیا ہے۔ تم خواہ مخواہ یہ کیوں چاہتے ہو کہ دنیا کے واقعات تمھاری تمناؤں کے مطابق ہوتے رہیں۔ یہ خواہش تمھاری پست ہمتی اور بے حوصلگی کی دلیل ہے، اگر زمانہ میں تمھاری ہر آرزو کامیاب ہوتی رہے تو تمھیں جینے کا مزہ ہی کیا ملے گا۔

شام کے وقت ہم دونوں قیصر باغ میں بیٹھے ہوئے تھے زیدی کسی خیال میں گم تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گردولواح کی ہر چیز اس نے اپنے حیطۂ شعور سے خارج کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو میری موجودگی کا بھی احساس نہ تھا۔ آخرکار مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھکر پوچھا "زیدی کس نئی دنیا کی سیر میں مصروف ہو؟ مجھے بھی بتاؤ تاکہ میں بھی اس نعمت سے بے بہرہ نہ رہوں" وہ چونکا مگر میرا جواب نہ دینے پایا تھا کہ پیچھے سے کسی نے غالب کا یہ شعر پڑھا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بس کیا تھا زیدی تڑپ گیا۔ لوٹ گیا گویا خود اس شعر میں جذب ہونا چاہتا تھا میں نے مڑکر دیکھا تو کالج کے دو متعلم قریب ہی ٹہل رہے تھے۔ ان کو شاعری سے بھی مذاق تھا دونوں نے ہم کو سلام کیا، زیدی نے ان کو بلایا اور شعر کو دوبارہ پڑھنے کی فرمائش کی اس کے بعد کہنے لگا "ایسے ہی اشعار ہوتے ہیں جو شاعر کو پیغمبروں سے اور شاعری کو وحی سے بالاتر تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ آپ باور کریجئے میں غالب کو بعض وقت اس "بادہ خواری" پر بھی "ولی" سے کہیں زیادہ عالی مرتبہ سمجھنے لگتا ہوں دیکھئے چند الفاظ وہ بات کہہ ڈالی جو بڑے سے بڑے نبی کے تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ کالڈرن (Calderon) ازمنہ متوسط کا ایک مشہور شاعر اسی خیال کا اظہار یوں کر گیا ہے۔ "انسان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں پیدا ہوا" گوتم بدھ بھی یہی کہتا ہے کہ "انسان کا نہ پیدا ہونا اس کے لئے سب سے بڑی نعمت ہوتی" آپ ہی بتائیے ہم دنیا میں آکر کس مقصد کی تکمیل کرتے ہیں؟ حیات کی سہ گانہ تقسیم لیجئے۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپے کو پورا کرکے تودہ خاک ہوجاتے ہیں، یہ تو کوئی ایسا مہتم بالشان مقصد نہیں معلوم ہوتا جس کے لئے پیدا

ہونے کی زحمت گوارا کی جائے ....." زبیدی غالباً کچھ اور کہتا مگر شام کا دھندلکا رات کی تاریکی میں تبدیل ہو چلا تھا اس لئے ہم دونوں گھر کی جانب روانہ ہوئے، راستہ میں میں نے کہا "تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا، تم ابھی کیا سوچ رہے تھے؟"

زبیدی ۔ صوفیہ کی حیات مستقبل کے متعلق کچھ غور کر رہا تھا۔

میں ۔ وہ کیا؟

زبیدی ۔ تم جانتے ہو کہ صوفیہ کا "ایوان عروسی" تعمیر ہونے والا ہے دیکھئے "قسمت" یا "اتفاق" نے "معمار" کسے منتخب کیا ہے میرا دل دھڑک رہا ہے، کہ کہیں اس کی شادی مجھے دکھ پہنچانے والی ثابت نہ ہو، میری آخری تمنا ہے کہ صوفیہ کو کوئی قدر شناس خاوند مل جائے۔

میں ۔ مجھکو بھی پہلے سے یہی تشویش رہتی تھی، میں اس فکر میں رہتا کہ صوفیہ کی شادی زبیدی کے ساتھ ہو جائے مگر آج زبیدی نے اپنے خیالات سے خبردار کر کے مجھے اس فکر سے بے نیاز کر دیا، اس لئے میں نے صرف ہمدردی کے خیال سے کہا "خدا کرے تمھاری یہ آخری تمنا بھی بر آئے" اور پھر اپنے مکان واپس آیا۔ چلتے وقت زبیدی نے مجھ سے کہا "کل دن

کا کھانا آپ بھی میرے مکان پر کھائیں گے اور شام تک میرے مکان پر رہیں گے۔"

صبح کے وقت ہیں ابوالفرح ایزدی کو لے کر زیدی کے مکان پر پہنچا، کھانا کھانے کے بعد مختلف موضوع پر گفتگو ہونے لگی، مسٹر ایزدی دوران مکالمہ میں ہر بحث کے بعد مس مہروان جی کا تذکرہ ضرور چھیڑ دیتا تھا۔ وہ مس صاحبہ کیطرف سے ظن بلیغ رکھتا تھا چنانچہ مس صاحبہ نے بھی ان کے جذبۂ خلوص اور دلی تمنا کا احترام کرتے ہوئے اس کے دولتکدہ کو اپنی اقامت گاہ بنایا تھا، ابوالفرح ایزدی کا افسانۂ حیات بیان کر دینا لطف سے خالی نہ ہوگا، وہ سندیلہ کے رہنے والے تھے ان کے والد وہاں کے سربرآوردہ اشخاص میں سے تھے، ابوالفرح نے انگلستان جاکر ایم۔ اے پاس کیا تھا، اور پھر جرمنی میں گٹنجن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ مگر باوجود اس کے کہ زیدی پر اس درجہ فوقیت رکھتے تھے وہ اس کو ہمیشہ اپنے سے برتر سمجھتا تھا اس کا قول تھا "زیدی کے پاس اسکا ذاتی فلسفہ اور اس کا اپنا جداگانہ علم ادب ہے مگر میں تو بس وہی جانتا ہوں جو دوسروں نے مجھے بتا دیا ہے۔"

مغربی فضا سے بہرہ اندوز ہوکر ابوالفرح ہندوستان واپس آیا اور لکھنؤ میں ۵۰۰ روپیہ ماہوار پر انگریزی کا پروفیسر مقرر ہوگیا۔ انگلستان جانے سے قبل ہی اس کو کسی پارسی دوشیزہ سے قلبی ارتباط پیدا ہوگیا تھا اور اس قلبی ارتباط نے کچھ دنوں کی مصاحبت کے بعد خوفناک محبت کی صورت اختیار کرلی تھی لیکن "کفر و ایمان کے امتیازی تفاوت" نے اتصال باہمی کو ناممکن ثابت کردیا۔ لڑکی کی تو کہیں شادی ہوگئی، مگر ابوالفرح نے اپنی تمام عمر تجرد میں گزار دینے کا عہد کرلیا تھا اور اسمیں شک نہیں کہ جس استقلال سے وہ اپنی "مفلوج زندگی" بسر کررہا تھا، وہ اسی کا حصہ تھا۔ صنمستان مغرب بھی اس کو اس عہد سے منحرف کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا تھا۔

زیدی ابوالفرح کے باطن کا غور سے مطالعہ کررہا تھا۔ جب کبھی وہ مس مہردان جی کا ذکر کرتا تو وہ اس کو ایک پرمعنی نگاہ سے دیکھکر مسکرا دیتا اور پھر خاموش ہوجاتا۔

تھوڑی دیر کے بعد ابوالفرح نے عورتوں کی ادبی ترقی پر بحث چھیڑ دی۔ اور معیار عروج مس موصوف کو قرار دیا زیدی نے ایک ایسی غائر نگاہ سے ابوالفرح کی طرف دیکھا کہ

اس کے سارے جسم میں خفیف لرزہ پیدا ہوگیا (زیدی کی نگاہ میں کچھ دنوں سے یہ خاص اثر پیدا ہوگیا تھا کہ وہ جسکو غور سے دیکھتا وہ کانپ ضرور جاتا غالباً اس کے قوت ارادی ارتقائی مدارج طے کر رہی تھی) اس کے بعد وہ سنجیدہ لہجہ میں ایزدی سے یوں مخاطب ہوا "ابوالفرح تمھارے لب و لہجہ سے پایا جاتا ہے کہ تم اپنی ممدوحہ کی ہر ہر ادا سے مرعوب ہو رہے ہو تم اگر شادی کر لیتے تو میں شاید کچھ اعتراض نہ کرتا لیکن تمھاری یہ مرعوبیت تمھارے "ذوق وفا" کا خون کر رہی ہے۔ مرعوبیت ہمیشہ قلبی تاثرات کی دلیل ہوا کرتی ہے، تمھارا دل یہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اس ہستی کے ہوتے ہوئے جسکی تم محبت کرتے ہو اور جو تمھارے خیال میں "صناعی فطرت کا بہترین نمونہ" ہے کسی دوسری عورت سے کسی نوعیت کا لگاؤ بھی پیدا کر سکے؟ مس مہروان کی علمی قابلیت کچھ نہ کچھ قابل تحسین تو ضرور ہوگی آخر لندن میں بچوں کی گہوارہ وجنبانی کرنے کیلئے تو گئی نہ ہونگی۔ لیکن اصل بات جو غور طلب ہے وہ یہ کہ انمیں وہ اوصاف ہیں یا نہیں جو عورت کو عورت بنا دیتے ہیں علم تو ہر عورت حاصل کر لیتی ہے اگر اس کو موقع دیا جائے اور میرا جہاں تک خیال ہے عورت

مرد کے مقابلہ میں زیادہ آسانی سے حاصل کرسکتی ہے رہ گیا نسوانی
شاعری کا سوال سو میری رائے میں عورت کو "شعر انگیز" ہونا چاہیے
شاعری کا لباس اس کو زیب نہیں دیتا۔ اس کے علاوہ مس
مہروان جی کی شاعری اس صنف ادب سے تعلق رکھتی ہے جس
کا نام والٹر بیجہٹ (Walter Begehot) نے (مکلف ادب) - ot nal
(Literalure) رکھا یعنی وہ ایسی شاعری ہے جسمیں الفاظ کی رنگینی اور
بندش کی چستی کے علاوہ معنوی کیف بہت کم ہے ایسی
شاعری "ذہنی بے مائگی" کا نتیجہ ہوتی ہے اور پبلک کو اپنی ظاہری
فوقیت سے متاثر کر کے ان کو گمراہ کر دیتی ہے، ابوالفرح تمھاری
زندگی مجھے بہت پیاری معلوم ہوتی ہے۔ اگر کوشش کر کے
آزمائشوں پر یکسر غالب آجاتے اور چند لغزشوں پر قابو پا جاتے
تو میں تمھیں "بزم ملائک میں مسند اعلیٰ" کا حقدار سمجھتا۔"

زیدی جب اپنا سلسلہ کلام ختم کر چکا تو میں نے دیکھا کہ
ابوالفرح کی ہیجانی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ہیں ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ اس یاد دہانی نے اس کے جذبات کو اکسا کر اس کے
دماغ کو مختل کر دیا ہے، وہ دیوانہ وار ادھر ادھر دیکھنے لگا۔
پھر کرسی سے اٹھکر ٹہلنا شروع کیا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس

کی سانس اتنی بھاری ہوگئی تھی کہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ زیدی یہ سب کچھ نہایت سکوت و غور کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ لیکن جب ابوالفرج کے آنسو گرنا شروع ہوگئے تو ایک سکون آفریں انداز سے مسکراتا ہوا اس کے قریب گیا اور اس کو زبردستی کرسی پر بٹھایا اور بولا "آخر روتے کیوں ہو؟ مجھے معلوم ہے کہ دنیائے محبت میں تم یکتا ہو میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جو لغزشیں تم سے سرزد ہو جایا کرتی ہے تقاضائے بشریت ہے مگر کوشش کرو تو بشریت کو مغلوب کر سکتے ہو۔

یزداں بکمند آوارائے ہمت مردانہ

خدا کے لئے رونا بند کرو۔ اچھا ادھر دیکھو، اگر آج تمھاری ناہید کا نامۂ مودت آجائے تو تم مجھے کیا سمجھو گے؟ غیب داں تسلیم کرلوگے یا نہیں؟"

ابوالفرج۔ (آنسو پوچھتے ہوئے) زیدی تم سمجھتے ہو کہ میں خفا ہوکر رونے لگا اور اس لئے مجھے بہلانا چاہتے ہو، نہیں تم جو کچھ کہتے ہو بہت درست کہتے ہو، ہاں تمھارا ایک ایک حرف طلائی تحریروں میں ضبط کئے جانے کے لائق ہے مجھے اپنے اعصاب پر قابو رکھنا چاہیئے تھا۔

زیدی۔ میں نے جو کہا وہ محض تمھیں بہلانے کے لئے نہ تھا۔
ابوالفرح۔ کیا تم سچ کہتے ہو کہ آج ناہید کے پاس سے کوئی خط آئیگا؟
زیدی۔ امید تو ایسی ہی ہے۔

میں نے پہلے یہ خیال کیا تھا کہ زیدی نے صرف ابوالفرح کی پریشانی اور وارفتگی کو دور کرنے کی غرض سے یہ کہا تھا کہ ناہید کا خط آنے والا ہے، اس لئے جب اس نے اپنی پیشین گوئی کا متانت سے اعادہ کیا تو میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا

زیدی۔ (مجھے متحیر دیکھکر) نعمان اگر میرا کہنا سچ ثابت ہو تو تم کیا خیال کروگے؟
میں۔ نبی سمجھنا کفر ہے تو ولی یا ساحر تو ضرور ہی مان لوں گا، پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم کن مقدمات پر ایسا دعویٰ کرتے ہو؟
زیدی۔ (میرے سوال کو قابل اعتنا نہ سمجھکر) تم نے وہ جواب نہ دیا جو میں دیتا، نعمان اگر تم برابر پیشینگوئیاں کرتے رہو اور وہ برابر پوری ہوتی رہیں تو بھی میں تمھیں وہی نعمان سمجھونگا ولی یا خارق عادات میں کونسی ایسی خصوصیت ہے جو ہم میں اور آپ میں نہیں ہے اور جس کی بنا پر آپ مجھے یہ خطاب دے

دینے میں ذرا تامل نہ کریں گے؟

۳ بجے چائے پی کر ہم لوگ ابوالفرح کے مکان پر گئے اس خیال سے کہ وہاں سے سب ایک ساتھ کالج چلیں گے، مس مہروان جی سے ہمارا تعارف کرایا گیا، ابوالفرح پر ابھی تک اضمحلال مستولی تھا اور یہ اضمحلال وقتی نہیں بلکہ مستقل اور پائیدار معلوم ہوتا تھا وہ مس مہروان جی کو یار سمجھنے لگا تھا زیدی نے بے پروائی سے مس مہروان جی سے مصافحہ کیا اور میرے پہلو میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا، ایک خدمتگار طشتری میں سگریٹ لے کر آیا، اس نے ایک سبز لفافہ ابوالفرح کو دیا جو اس نے کہا کہ آج ہی ڈاک سے آیا ہے، ابوالفرح خط پڑھنے میں مشغول ہوگیا زیدی اس کو دیکھ دیکھکر مسکرا رہا تھا میں یہ جاننے کیلئے بیتاب تھا کہ یہ خط ناہید کا ہے یا نہیں خط کو ختم کر چکنے کے بعد ابوالفرح نے کہا "زیدی مجھے تم سے ڈر معلوم ہونے لگا ہے، واقعی یہ وہی خط ہے"

زیدی۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ آپ کو مجھ سے ڈر معلوم ہونے لگا

مس مہروان جی نے ہماری حیرت کا سبب نہ سمجھ کر پوچھا "یہ ہے کیا جس پر آپ لوگ اس قدر متحیر ہو رہے ہیں"؟

ابوالفرح۔ (زیدی کی جانب اشارہ کرکے) آپ نے اسی خط کی بابت پیشینگوئی کی تھی اور دعوے کے ساتھ۔ مس صاحبہ کو بھی یہ سنکر پہلے تو تعجب ہوا مگر انھوں نے یہ کہکر اپنا تعجب رفع کردیا کہ یہ محض ایک اتفاقی امر تھا“ زیدی نے کچھ جواب نہ دیا اور سگریٹ پینے لگا وہ جب کسی خاص جانب متوجہ نہیں ہونا چاہتا تھا تو سگریٹ پر سگریٹ پینا شروع کردیتا تھا۔ چنانچہ وہ آدھے گھنٹے کے اندر ایک ”مہالا“ ختم کرچکا تھا اور دوسرا پی رہا تھا۔

۴½ بج چکے زیدی اور مس مہروان میں کسی خاص موضوع پر مکالمہ نہ ہوسکا۔ ہم کالج جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ مس مہروان جی کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ وہ زیدی سے کھل کر ملنا چاہتی ہے مگر زیدی کے ”سکوت پندار“ نے اسے ایسی جرأت سے باز رکھا کالج میں زیدی اور مس مہروان جی کی تقریریں سننے کیلئے شہر کے اکثر معزز اشخاص آئے تھے مس مہروان جی تو خیر ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک شہرت حاصل کرچکی تھی زیدی تمام ہندوستان میں مقرر تو نہیں مشہور تھا تاہم ہر رسالہ اور اخبار کا اڈیٹر اس کو ایک نادر

انشاپرداز کی حیثیت سے جانتا تھا اور لکھنؤ میں تو ہر شخص اسکا قائل تھا۔ اگرچہ بہت کم ایسے تھے جو اس سے محبت کرتے ہوں مس مہروان جی نے نہایت جوش کے ساتھ " ہندوستان میں نسوانی تمدن " پر " اسپیچ دی " اس میں کوئی ایسی بات نئی نہ تھی جو دہرائی جائے گو دوران تقریر میں " ارتقاء " " جہد للبقا " " بقاے اصلح " " انتخاب، طبیعی " جیسے رعب آفریں الفاظ بار بار استعمال کئے جاتے تھے، جن سے پبلک بیحد متاثر معلوم ہوتی تھی۔ اور جو زیدی کو ہنسا دیتے تھے۔

زیدی کا مبحث " انسان اور اس کی قوت ارادی " تھا۔ اس نے یہ ثابت کیا کہ انسان اگر اپنے نفس پر اختیار پالے اور اسکی قوت ارادی کی تکمیل ہو جائے تو وہ ایسے کاموں کو انجام دے سکتا ہے جو " فوق الفطرت " تو نہیں مگر " فوق الانسانیت " ضرور کہلائے جاسکتے ہیں، اس طرح ہم ایسی آوازیں سن سکتے ہیں جو معمولی انسان کے " دائرہ سماع " سے باہر ہیں۔ سب سے زیادہ حیرت ناک بات جو اس سلسلہ میں اس نے کہی وہ یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ ایک طبیب حاذق ہونے کے علاوہ " معالجات " لغا ہی یا " معالجات نفسی " (Hypnotic Therapeuties)

(Psycho - Therapeuties) کے زبردست ماہر تھے اور اس نے یہ بھی کہا کہ یہ "نظام علاج" محض شعبدہ بازی یا ابلہ فریبی نہیں ہے بلکہ ایک ناقابل تردید حقیقت اپنے اندر رکھتا ہے اور قوت ارادی کے تابع ہوا کرتا ہے اس پر سننے والے زیدی کا منہ تکنے لگے۔

مس مہروان جی کے اصرار کا لحاظ کر کے ہم سب پھر ابوالفرح ایزدی کے مکان پر گئے۔ ابوالفرح اس دفعہ مس مہروان جی کے لکچروں سے مرعوب نہیں ہوا بلکہ وہ بھی زیدی کا ہم آہنگ تھا مس مہروان جی نے زیدی کے سکوت بے محل سے تنگ آکر کہا "کیوں مسٹر زیدی آپ اس قدر خاموش کیوں ہیں؟"

زیدی۔ اس ناگہانی تخاطب کے لئے تیار نہ تھا۔ اس لئے ایک مصنوعی تبسم کے ساتھ جواب دیا "میں ابھی تک یہی فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے کس موضوع پر آپ سے گفتگو کرنی چاہئیے"

مس مہروان جی:۔ (زیدی کے تصنع سے کبیدہ ہو کر) ہم اور آپ اتنی دیر سے ایک دوسرے کی صحبت میں ہیں لیکن لکچر کے علاوہ آپ کی زبان سے کسی موقع پر کوئی لفظ نہیں سنا گیا۔ کوئی خاص موضوع پر نہ سہی التفنن طبع ہی کے لئے کچھ بولئے"

ابوالفرح ۔ زیدی بیکار نہیں بولا کرتے کوئی بحث چھیڑ دیجئے پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار ۔"

مس مہروان جی ۔ (زیدی سے) آپ نے اپنی اسپیچ میں عجیب و غریب خیال کا اظہار کیا کیا ہے کہ اس باب میں واقعی آپ اپنے معتقد ہیں؟

زیدی ۔ آپ کے سوال کی بہتر صورت یہ تھی کہ "کیا واقعی یہ حقیقت ہے؟"

مس مہروان جی ۔ اچھا یوں ہی سمجھئے ۔

زیدی ۔ تو بلا تامل میں اپنے دعوے کی تکرار کرتا ہوں کہ اگر انسان کی قوت ارادی مکمل ہو جائے تو وہ اُڑ بھی سکتا ہے یہی نہیں بلکہ جیسا کہ برنرڈ شا کا خیال ہے قوت ارادی انسان کی عمر طبعی کی میعاد ۳۰۰ یا ۲۵۰ برس تک بڑھا سکتی ہے ۔

مس مہروان جی ۔ (طنزاً) اچھا یہ بتایئے آپ کی قوت ارادی کمال حاصل کر چکی ہے یا نہیں؟ اگر کر چکی ہے تو آپ کون سا اعجاز دکھا سکتے ہیں؟

زیدی ۔ میں چاہوں تو ابھی آپ کو اپنا ہم نوا بنا لوں، اگرچہ میری قوت ارادی تکمیل کے کل مدارج نہیں طے کر چکی ہے یہ کہکر اس نے مخصوص انداز سے مس مہروان جی کو دیکھا

اور وہ چونک پڑی۔ زیدی کا یہ غیر شعوری وار خالی نہیں گیا
مس مہروان جی پھر کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکی وہ کچھ گھبرائی
سی معلوم ہوتی تھی۔

زیدی۔ (خدا جانے کس مصلحت سے بحث کو بدلکر) اب آئیے دنیا کے معاملات پر کچھ غور کیا جائے۔ مس صاحبہ آپ کی اسپیچ دلکش ضرور تھی، لیکن ہم یہ نہ جان سکے کہ آپ نے اپنی جنس کی اصلاح و بہبود کے لئے کیا "لائحہ عمل" تیار کیا ہے؟

مس مہروان جی۔ یہ تو دنیا جانتی ہے کہ جب تک ہماری قوم دیگر ممالک متمدنہ کی طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں کافی ترقی حاصل نہ کرلے جب تک "ہندوستان" یقیناً دوسروں کا محتاج رہے گا۔ پھر چونکہ قوم کی تعلیم و تربیت کا انحصار عورتوں پر ہے اس لئے بغیر عورتوں کی اصلاح کے قومی اصلاح کی امید عبث ہے........

زیدی۔ (بات کاٹ کر) معاف فرمائیے، آپ پھر اسپیچ کی روش پر چل نکلیں۔ یہ تو ہم آپ سب جانتے ہیں کہ ہماری تعلیم و تربیت کی بیشتر ذمہ دار عورتیں ہیں ہیں "تہذیب لنسواں" کا موید ہوں آپ صرف یہ بتا دیجئے کہ اس باب میں کون سا پہلو اختیار کرنا

ان کے لئے امید افزا ہو گا۔

مس مہروان جی۔ میری رائے میں ممالک مغربی کو ہر وقت ہمارے پیش نظر ہونا چاہیئے، اسی زمانے سے جبکہ میں یورپ میں تھی یہ بات میرے ذہن میں منقوش ہے کہ عورت اور مرد کو دوش بدوش تمدن کے مدارج طے کرنے چاہئیں، یہ کیا کہ مرد دنیا کی تمام لذتیں حاصل کرتا ہے اور عورت ان سے محروم رہتی ہے، مرد قدرت کی بہترین نعمت یعنی باہر کی کھلی اور صاف ہوا سے اپنی صحت کو قائم رکھ سکتا ہے، عورت اس سے بے بہرہ سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان میں کم از کم ۲۵ فیصدی عورتیں صرف اسی ایک وجہ سے ثبور سلیہ (Tuberclosis) میں مبتلا ہوتی ہیں مرد مجالس میں تجویزیں پیش کرتا ہے ملک کے اصلاحی امور میں مداخلت کرتا ہے، عورت کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوتا، مرد تعلیم پاتا ہے، دنیا کے تمام مسائل کو وہ سمجھ لیتا ہے اور اپنی آزاد رائے قائم کرتا ہے۔ لیکن عورت گھر کی چہار دیواری میں اس سے معذور رکھی جاتی ہے زیدی صاحب آپ ہی انصاف کیجیئے کہ عورت کی یہ بے بسی اور بیچارگی آخر کیوں روا رکھی جاتی ہے؟ وہ مرد سے کس لحاظ سے کمتر ہے؟ جب تک یہ سلسلہ

کلام جاری رہا، زیدی سکوت کے ساتھ سنتا رہا۔ مس مہروان جی نے اپنی گفتگو ختم کی تو وہ کچھ دیر کے لئے غور کرنے لگا۔

مس مہروان جی نے اس کے جمود کو توڑنے کی غرض سے کہا "آپ خاموش کیوں ہیں"؟

زیدی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ آپ کے خیالات کہاں تک اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ نے جو کچھ بیان کیا وہ اس قدر غیر واضح اور مبہم ہے کہ آپ خود اس سے کسی منضبط نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتیں تاہم میں آپ کا مقصد سمجھ گیا، آپ کے اکثر اعتراضات وہی ہیں جو مدت سے ہوتے آئے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان میں سے زیادہ تر قابل اعتنا ہیں۔ مگر آپ کا یہ کہنا کہ ممالک مغربی کو ہمارے پیش نظر ہونا چاہئیے۔ بحث طلب ہے تہذیب نسواں کا سوال برطرف مجھے تو اسی میں شبہہ ہے کہ یورپ کی تہذیب مردوں کے حق میں بھی قابل اطمینان ہے یا نہیں عورت اور مرد کو دوش بدوش ترقی کے منازل طے کرنے چاہئیں، اس سے مجھ کو بھی اتفاق ہے مگر جن نظریات کی غالباً آپ حمایت کرنا چاہتی ہیں ان سے انحراف کرنے پر مجبور ہوں۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ عورت مرد سے کس حیثیت

میں کمتر ہے کئی لحاظ سے مرد ہی عورت سے کمتر ہے، میں تو بس اتنا جانتا ہوں۔ اور اسی پر زور دیتا ہوں کہ عورت اور مرد دو متبائین اور غیر متجانس ہستیاں ہیں۔ لہذا عورت اور مرد میں یکسانی نہ ہونی چاہیئے یکسانی میں کوئی لطف نہیں، لطف تو ہم آہنگی میں ہے اور ہم آہنگی (Harmon) دو مختلف آہنگوں کے ربط باہمی سے پیدا ہوتی ہے، ذکور و اناث کے فرائض کی نوعیت اگر ایک ہو جائے تو دنیا بے رنگ ہو جائے مرد کا کام یہ ہے۔ کہ کونسل یا پارلیامنٹ میں تحریک کر کے ملک و قوم کی اصلاح کرے تو عورت کا کام یہ ہونا چاہئے کہ مردوں میں ایسے کاموں کے انجام دینے کی صلاحیت پیدا کر دے اسی کا نام ہم آہنگی ہے۔ "ہم آہنگی" اور "یک آہنگی" میں بڑا فرق ہے عورت کو تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہیئے اور ہیئت اجتماعی کا منصب اولین یہ ہے کہ اس کے لئے حصول علم کے بہترین ذرائع فراہم کرے لیکن تعلیم نسواں کا مقصد "تربیت النساں" کے کن مسائل میں آسانیاں پیدا کرنا ہے جو صیانت حیاتِ اجتماعی کے لئے سودمند ہوں، اور اگر نسوانی ترقی کو آپ صرف ادب و شاعری تک محدود کرنا چاہتی ہیں تو مجھے اس کی مخالفت کرنے کی اجازت دیجئے۔

اس کے ہاتھوں بہک کر مرد ہی کیا کم تباہ ہو رہے ہیں کہ عورت کو بھی اس کی اجازت دیدی جائے "کار زمین" کی تکمیل سے پہلے "آسمان پروازی" مضحکہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ وسیع تر ذمہ داریوں سے روگردانی کر کے شاعری میں لگ جانا کچھ بیمحل سا معلوم ہوتا ہے، یہاں تک تو آپ کی ادبی ترقی سے بحث تھی اب کچھ تمدنی و معاشرتی مباحث پر بھی غور کرنا چاہیئے۔

حریت النسانی کے متعلق میرا خیال ہے کہ عورت اصولی۔ نقطۂ نظر سے تو مرد کی ہمسری ضرور کر سکتی ہے مگر عملی حیثیت سے دونوں کے مناصب زندگی کی نوعیت ایک ہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ دونوں اقتصادی زاویہ نظر سے ایک سطح پر نہ آجائیں جو اس لئے محال ہے کہ عورت اور مرد کی ترکیب عناصر میں بڑا فرق ہے۔ ان امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ عورت مرد کے ساتھ "تعاون جنسی" پیدا کرے اور مرد اس کی کفالت کا ضامن بنے۔

ابوالفرح (بات کاٹ کر اور صرف حجت کی غرض سے) مگر تعاون جنسی سقراط و افلاطون کے نظریات کی رو سے دعوت عام کی صورت میں بھی تو ممکن ہے، اور یہ ایک ایسی صورت ہے جو اقتصادی

امتیاز کو بھی مٹا سکتی ہے۔ اس کی بابت آپ کی کیا رائے اور آپ اس میں کونسا نقصان دیکھتے ہیں؟ کوئی عورت کسی مخصوص مرد کی ملکیت کیوں قرار دیجائے؟ کیوں نہ ہر مرد اور ہر عورت کے درمیان تعلقات زوجی جائز کر دیئے جائیں!۔

زیدی۔ آپ نے سقراط و افلاطون کے نظریات تو یاد رکھے اور ارسطو نے ان پر جو تنقید لکھی ہے اسے بھول گئے" ہر چند کہ ارسطو کی تنقید بھی کچھ اس قدر مبہم اور ناقص ہے کہ اس کی تردید میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ تاہم اس کو پلیٹو (فلاطون) کے متخیلات پر اس لئے فوقیت حاصل ہے، کہ وہ دنیا میں نسبتاً زیادہ سہولت کے ساتھ عملی پیرایہ اختیار کرسکتی ہے۔ پلیٹو کا نظام کامیاب نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ "شعور جنسی" (Sex Causciousness) اور اس کے تمام عوارض کی ساری اہمیت مجہول نہ ہوجائے اور کم از کم آئندہ چند صدیوں تک یہ ناممکن ہے۔ سب سے پہلے تو عورت کی فطرت ہی "فلاطونیت" (Platonism) کی مخالفت کریگی اس کے علاوہ "تربیت النسان" میں دشواریاں لاحق ہونگی، پرورش اولاد کے فرائض اجتماعی نہیں بلکہ شخصی و انفرادی ہونی چاہئیں نہیں تو نظم و انضباط کے بجائے فتنہ

وفساد کا خوف ہے اس ضمن میں کچھ مسئلہ مناکحت کی بات بھی کہنا چاہتا ہوں۔ شادی سے قبل طرفین کا استمزاج لے لینا تو غالباً تمام دنیا کی نگاہوں میں ضروری ہے۔ لیکن اتحاد ازدواجی کے بعد میری رائے میں طلاق صرف ایک حالت میں جائز سمجھنا چاہیئے اور وہ یہ کہ فریقین میں سے کوئی اپنے کو اخلاقاً اس کا سزاوار ثابت کردے۔ مثلاً بیوی اگر شوہر کے ساتھ بیوفائی کرے تو شوہر کو حق ہے کہ اس کو طلاق دیدے اور اگر شوہر بیوی کے ساتھ پیمان وفا نباہنے میں کوتاہی کرے تو بیوی بھی شوہر کو طلاق دے سکتی ہے سوسائٹی کو کسی اور صورت کے طلاق کی اجازت نہ دینی چاہیئے۔

دوسری بات جو اس سلسلہ میں مجھے کھٹکتی ہے وہ تعداد ازدواج ہے۔ جس میں کوئی شعریت نہیں یہ ایک شرمناک رسم ہے اگر عورت کا بیک وقت چار خاوند رکھنا معیوب ہے تو مرد پر بھی ایک سے زیادہ بیوی حرام ہونی چاہیئے۔ جو لائحہ عمل میں پیش کررہا ہوں اگر دنیا اس پر کاربند ہوجائے تو بہت سی خرابیاں مٹ جائیں۔

یہاں تک میں آپ کا ہمنوا ہوں کہ عورتوں کو باہر

کی ہوا سے محروم رکھکر ان کو اکثر بیماریوں کا شکار بنا دیا جاتا ہے یہ بڑا ظلم ہے جس کے روکنے کی ضرورت ہے مگر عام مجالس میں ان کی بیباکانہ شرکت بھی کچھ مکروہ سی بات ہے عورت کو بوئے غیر سے جھجکنا چاہیئے یہ اس کا خاصہ طبعی ہے، نسوانی وقار و خودداری کا تقاضہ یہ ہے کہ عورت عام مردوں میں ایک اجنبیت محسوس کرے اور اپنے کو مخصوص سمجھے۔

(۴)

قسمت کی ستم ظریفیاں بھی عجیب و غریب ہوا کرتی ہیں "تدبیر و تقدیر" کے مباحثے تو بہت فرسودہ ہیں ان کا چھیڑنا بے سود ہے۔ لیکن میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ زندگی کے اکثر واقعات پر توجہ کرتے ہوئے میرے ذہن سے ایک دھیمی اور متزلزل آواز آتی ہے۔ کہ کوئی ایسی فوق الادراک قوت کہیں پس پردہ مصروف کار ضرور ہے۔ جس کے سامنے انسانی کوشش مجہول ہو جاتی ہے مجھے اس سے بحث نہیں کہ آپ اس قوت کو "تقدیر" کہیں "نیچر" کہیں یا کچھ نہ کہیں، میں خود اس کو کچھ کہنا نہیں چاہتا، ہر چند میں اس آواز کو اپنے "اعصاب نخاعی" (Medullon or Spinalnerves)

کی یاندگی کا نتیجہ خیال کرتا ہوں اور اس کے نقوش کو فوراً مٹا دیتا ہوں تاہم جب پھر کوئی ایسا ہی وقت آجاتا ہے تو پھر وہی "صدائیں" سنتا ہوں۔

وہاج الدین صاحب کو صوفیہ کے لئے خاوند کی تلاش تھی۔ ہر سمت سے سلسلہ جنبانیاں ہو رہی تھیں مگر ابھی تک ان کے معیار انتخاب پر کوئی پورا نہیں اترا تھا۔

زیدی کے خیالات سے تو میں آگاہ ہو چکا تھا اور اس کی جانب سے اک گونہ اطمینان تھا۔ مگر صوفیہ کے دل کی کیفیت سے پوری طرح آگاہ نہ تھا اس کا مزاج داں بننے کے لئے میں بیتاب تھا۔ مجھے نہ جانے کیوں یہ کھٹکا تھا کہ اس کی تمناؤں کا اتلاف ہونیوالا ہے اسی غرض سے میں اس سے بے تکلفی پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا اور تھوڑی ہی مدت میں میرا مقصد پورا ہوگیا۔ صوفیہ مجھ سے کھل کر ملنے لگی اس لئے کہ میں اس سے طرح طرح کی دلچسپ باتیں کرتا اور نئی نئی علمی اور ادبی کتابیں اور وہ رسائل و جرائد جس میں کبھی کبھی زیدی کی نادر تحریریں شائع ہوتی تھیں لاکر دیتا، صوفیہ کا علمی مذاق چونکہ بہت بلند تھا اس کو مجھ سے بہت جلد دلبستگی پیدا

ہو گئی، زیدی کو جب اس واقعہ کا پتہ چلا تو اس نے کہا نعمان میں یہ جان کر نہایت مسرور ہوا کہ صوفیہ میں اور تم میں باہمی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے، اس کو ایک سچا ہمدم درکار تھا۔ خاندان میں کسی کو اس سے طبعی مناسبت بھی نہیں، ہمدمی اور موانست تو خیر بعد کے مدارج ہیں میں جب آپ اپنا ہمدم نہیں بن سکتا تو صوفیہ کو مجھ سے کیا توقع ہو سکتی ہے، لیکن للہ میری بابت اس سے کبھی گفتگو نہ چھیڑنا اور اگر کبھی وہ خود میرا تذکرہ شروع کر دے تو تم اس سے کسی حیلہ سے وہیں ختم کر دینا" مگر میں تو ارادہ کر چکا تھا کہ صوفیہ کے ان جذبات کی تحقیق کروں گا جو زیدی سے متعلق تھے۔

میں نے ایک صبح صوفیہ کو ہندوستان کا ایک مشہور اردو "مجلہ علمیہ و ادبیہ" لا کر دیا جس میں زیدی کا ایک بسیط مضمون "دنیائے متخیلہ" کے عنوان سے چھپا تھا اسمیں یہ بحث کی گئی تھی کہ دنیا کو علمی و ادبی، جمالی و اخلاقی، اقتصادی و سیاسی اور دیگر مختلف حیثیتوں سے کیا ہونا چاہئے..... "رئیس التحریر" صاحب نے مضمون کو اپنے رسالہ میں جگہ تو دیدی مگر اپنے نوٹ میں شاید اس خیال سے کہ کہیں عوام

الناس ان کو بھی زیدی کا پیرو نہ سمجھ لے اور اس طرح براہ راست یا بالواسطہ ان کی "ریاست" پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے ادارت کی پرانی اور زنگ آلودہ "سپر" سے کام لیا تھا یعنی انھوں نے یہ لکھ دیا تھا کہ "اڈیٹر کا نامہ نگاروں سے متفق الرائے ہونا ضروری نہیں" اسی دن شام کو پھر صوفیہ سے ملا سلسلۂ گفتگو شروع ہونے کے بعد میں نے پوچھا "آج جو رسالہ تمھیں دے گیا تھا اس کو دیکھا؟ کیسا ہے؟"

صوفیہ - جی ہاں! میں نے اسکو بہت دلچسپ پایا -

میں - (دلچسپ کے لفظ پر غور کرتے ہوئے) زیدی کی "دنیائے متخیلہ" کی بھی سیر کی؟

صوفیہ - میں نے نظم و نثر کے کل مضامین پڑھ ڈالے ہیں۔

میں - زیدی کو ایسے انوکھے نظریات سے بہت جلد دست کش ہو جانا چاہئے ورنہ دنیا ان کا ساتھ نہ دے گی اور وہ برباد ہو جائیں گے ۔

مجھے یہ خیال ضرور تھا کہ زیدی بہت جلد تباہ ہو جائیگا مگر بخدا یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے دلکش نظریات کو ترک کر دے ۔

صوفیہ نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا "ہر چند کہ میں تنقید وتبصرہ کی صلاحیت سے عاری ہوں اور بحث میں کامیاب نہیں ہوسکتی تاہم اتنا کہے بغیر نہیں رہوں گی کہ بھائی جان (زیدی) کی باتیں مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں کیونکہ وہ میرے خیال میں سچی ہوا کرتی ہیں۔ ابا جان نہ جانے کیوں ان کی ان باتوں سے بیزار رہتے ہیں۔ آپ کیوں سمجھتے ہیں کہ وہ تباہ ہونے والے ہیں؟

میں۔ اسلئے کہ دنیا والے ایسی سچی باتوں سے برسرپیکار ہیں۔

صوفیہ۔ صرف اس بنا پر تو "لاتلبسوالحق بالباطل" کے اصول سے انحراف کرنا بزدلی ہے، ان کی تباہی کا اگر ایک طرف صدمہ ہونا چاہئے تو دوسری طرف اس خیال سے مسرت ہونی چاہئے کہ وہ اپنی صداقت پر قائم رہے۔

صوفیہ مجھے بہادری کا سبق دے رہی تھی اور میں اسے درازئی عمر کی دعائیں۔ مجھے آپ اپنے پر ہنسی آنے لگی اور صوفیہ پر رونا، اس کا قدر داں اگر کوئی ہوسکتا تھا تو زیدی مگر زیدی اپنے "استحالات" میں الجھ کر خدا جانے کیا کرنیوالا تھا۔ میں نے پھر صوفیہ سے کہا "زیدی کبھی تم سے یا گھر میں

دوسری عورتوں سے بھی باتیں کرتے ہیں یا نہیں ؟"

مجھے یقین ہے کہ میرے اس سوال نے اس کے دل کی گہرائیوں میں ایک ہنگامہ زا ارتعاش پیدا کر دیا ہوگا۔ مگر اس نے کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس نے جواب دیا" بلا ضرورت وہ عورتوں سے گفتگو نہیں کرتے مجھ سے بھی زیادہ باتیں تو نہیں کرتے البتہ کتابیں اکثر پڑھوا کر سنتے ہیں اور نکات کی تصریحات کرنے سے اگر میں قاصر رہ جاتی ہوں تو وہ خود مجھے نہایت وضاحت کے ساتھ سمجھا دیتے ہیں، میرے لئے ہر ماہ وہ اچھی اچھی کتابیں منگاتے رہتے ہیں چنانچہ میرے پاس کتابوں کا ایک کافی ذخیرہ ہو گیا۔ یہ بھائی جان کی خاص عنایت ہے جس سے وہ مجھے ممتاز کرتے ہیں۔"

اتنے میں زیدی بھی اندر داخل ہوا۔ وہ کچھ متفکر سا معلوم ہوتا تھا۔ ہم کو دیکھکر وہ مسکرایا اور پھر جلدی سے دوسرے کمرے کی طرف روانہ ہوگیا میں نے لپک کر اس کے کوٹ کا دامن پکڑ لیا، اور پوچھا" آخر اس عجلت کے ساتھ کہاں جا رہے ہو ؟ (صوفیہ کی طرف اشارہ کر کے) چلو وہاں چل کر کچھ جی بہلا لو۔ صوفیہ چونکہ مذاق سلیم رکھتی تھی اس لئے غالباً آپ کا اس کی معیت میں

چند لمحے گزار دینا تضیع اوقات نہ ہوگا۔"

زیدی۔ تم ایک ہی سانس میں بہت سی باتیں کہہ جاتے ہو یہ میرے لئے بڑی آفت ہو جایا کرتی ہے۔ حسنین ابھی لاہور سے آئے ہیں اور میرے مکان پر قیام کریں گے، میں والدہ کو اسکی اطلاع دینے جا رہا ہوں"۔

میں۔ آخر حسنین آئے ہیں کوئی عفریت تو نہیں آپہنچا جو آپ اس قدر سراسیمہ ہوئے جاتے ہیں۔

زیدی۔ تم جانتے ہو کہ میں حسنین کی صحبت سے کتنا گریز کرتا ہوں

یہ کہکر وہ چلا گیا اور میں صوفیہ کے پاس واپس آیا، اس نے مجھ سے فوراً کہا" بھائی جان کچھ پریشان نظر آرہے ہیں آپ سے اُن سے کیا باتیں ہوئیں"؟

میں۔ کچھ نہیں۔ یوں ہی زیدی کا جب جی چاہتا ہے پریشان ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ایک پرانے ہم جماعت آج لاہور سے ملنے آرہے ہیں انھیں کا تذکرہ ہو رہا تھا، اتنا کہکر میں حسنین سے ملنے باہر کے کمرے میں چلا آیا جہاں زیدی بھی موجود تھا۔

حسنین علیگڈھ چھوڑنے کے بعد انگلینڈ چلا گیا تھا۔ اب بیرسٹری پاس کرکے واپس آیا اور لاہور میں بیرسٹری شروع

کردی۔ واپس آئے کچھ ہی عرصہ ہوا ہوگا کہ اس کو زیدی یاد آیا، چنانچہ فوراً اس سے ملنے کے ارادہ سے لکھنؤ پہونچا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ نہایت تپاک سے آگے بڑھا اور بغلگیر ہوتے ہوئے کہا "مجھے امید تھی کہ آپ حیدرآباد میں ہونگے۔"

میں۔ چند اسباب کی بنا پر میں حیدرآباد سے استعفا دیکر چلا آیا۔

حسنین۔ ہاں اور زیدی سے معلوم ہوا کہ اب آپ لکھنؤ کالج میں اقتصادیات کے پروفیسر ہیں۔ یہ لائن بھی بڑی نہیں۔

اس کے بعد مختلف مباحث پر گفتگو ہونے لگی۔

ایمرسن (Emerson) کہتا ہے دیوانوں کو اچھا کرلو۔ شراب خواروں کی شراب چھڑا دو۔ قاتلوں کو (قتل سے) باز رکھو مگر ایک "خراب کردہ نفسانیت" کے لئے کیا علاج سوچ سکتے ہو" حسنین کے حرکات و سکنات و خیالات و معتقدات سے سرمو فرق نہ ہوا تھا۔ اس کی ایک ایک ادا گواہ تھی، کہ وہ "ابتہاجیت" (Hedonism) کے نشہ میں سرشار ہو رہا ہے" ایقوریت" (Epicureanism) اس پر اب پیشتر سے بھی زیادہ غالب معلوم ہوتی تھی، حسن و وفا کی غارتگری کو ابھی تک وہ پایۂ افتخار تصوّر کرتا تھا۔ لکھنؤ میں ایک ہفتہ تک جیسی ہوسکارانہ

زندگی اس نے بسر کی اسکی تفصیل نہیں کیجا سکتی۔ اس کی انھیں بے اعتدالیوں سے ایک مشہور ممثلہ (ایکٹرس) کا المناک حیات بھی منسوب ہے۔ جس نے حسنین کے "داعیات محبت" پر یقین کرکے اپنی خوشگوار زندگی کو ہمیشہ کے لئے الوداع کردیا اور پھر کہیں کی نہ رہی، واللہ اعلم اس کا انجام کیا ہوا۔

رخصت ہونے سے ایک دن پہلے جبکہ حسنین شام کو سیر و تفریح سے لوٹا تو زیدی نے اس سے کہا "حسنین خدا کے لئے اس دل آزار زندگی کو چھوڑ دو، تم نے کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر غور کیا کہ فیروزہ (ایکٹرس) اب کہاں جائے؟ تم اس کے ساتھ اگر فوراً شادی نہ کروگے تو میں تمھارا منہ دیکھنے کا روادار نہ ہوں گا۔"

حسنین۔ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ خود تو اسقدر شرافت و معصومیت کے دلدادہ ہو اور مجھ کو یہ مشورہ دے رہے ہو کہ میں ایک رذیل اور بازاری ایکٹرس کو اپنی رفیقۂ زندگی بنالوں، اس کے علاوہ تمھاری وہ تعلیم کیا ہوئی "محبت کو پابند مناکحت نہ ہونا چاہئے۔"

زیدی۔ فیروزہ ہرگز رذیل یا بازاری عورت نہیں ہوسکتی ورنہ اس آسانی سے وہ تمھارے جال میں گرفتار نہ ہوجاتی۔ معلوم ہوتا ہے

کہ وہ مصنوعی رومانیت اور بطلیت سے بیزار ہو چکی تھی اسی لئے ذرا سی تحریک پر وہ ایک سچی ہیروئن بن جانے کو تیار ہو گئی میں تو اب بھی کہتا ہوں کہ محبت کو مناکحت تک محدود نہ رکھنا چاہئے۔مگر تم کو فیروزہ سے محبت کہاں ہے؟ اور اگر ہو بھی تو ایسی حالت میں اس کا دنیا میں کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ تمھارا اس کے ساتھ شادی کر لینا بقائے محبت کے لئے ضروری ہے کیا تم اس خیال سے اپنے دل میں کوئی درد نہیں محسوس کرتے کہ اس نے بے تامل تمھارے "عہد وفا" کو استوار تسلیم کر کے اپنے کو تمھارے حوالہ کر دیا اور اپنی دنیائے کامیابی کی مطلق پروا نہ کی۔

حسنین :۔(قہقہہ لگاکر) زیدی تم ذرا بھی نہیں بدلے۔تمھارے ان "خرافات" کا خاتمہ ہوگا یا نہیں؟ "پیمان وفا" کا دوسرا نام "اعتراف شکست" ہے اور اپنی شکست اس دنیا میں غالباً آخری مجبوری ہے جو میں گوارا کر سکتا ہوں۔

زیدی ۔(ایک تلخ تبسم کے ساتھ) تم تو اپنی شکست کا اعتراف قدم قدم پر کرتے جاؤ، ممکن ہے تم کو اس کا بھی احساس نہ ہو (میز کی دراز سے ایک پستول نکال کر اور حسنین کو نشانہ بنا کر)

دیکھو تم جس چیز کو "میں" سمجھے ہوئے ہو اس کو تو میں اپنی ایک انگلی کی خفیف سی خفیف جنبش میں نابود کرسکتا ہوں، مگر وہ چیز جو فی الحقیقت "میں" کی "تعبیر" ہو سکتی ہے یعنی تمھاری "روح" شکست پر شکست کھارہی ہے اور ہر شکست پہلی شکست سے کہیں زیادہ ناقابل تلافی ہوتی ہے، ابھی تک تو تم سے جو خطرات پیدا ہوتے ہیں ان سے صرف تمھاری ذات متاثر ہورہی ہے، مگر مجھے خوف ہے کہ عنقریب وہ سوسائٹی کو نقصان پہنچانے والے ثابت ہوں گے۔

اس نے پستول پھر دراز میں رکھدیا، اس کی اس حرکت سے میں متحیر رہ گیا۔ حسنین بھی چند منٹ کے لیے گھبراگیا تھا لیکن پھر اس نے اپنے حواس درست کرکے کہا "تمھارے لکچر نے مجھے بیحد مسرور کیا۔"

حسنین کی سیہ کاریوں سے میرے یا زیدی کے سوا کوئی دوسرا خبردار نہ تھا، بلکہ بالکل اس کے خلاف اس کی ظاہری تہذیب اور اخلاق کی فوقیت سے ہر شخص اس کی طرف مائل نظر آتا تھا، وہاج الدین صاحب اس کے گرویدہ ہوگئے، کیونکہ حسنین بھی ان کا بہت لحاظ کرتا تھا اور زیادہ تر انھیں کے پاس بیٹھا ان کا

دل بہلایا کرتا تھا اور وہاج الدین صاحب سے جو زیادہ مانوس ہو جاتا وہ اسے فرشتہ تسلیم کرنے میں مطلق دریغ نہ کرتے۔

حسنین ایک ہفتہ قیام کرکے پھر لاہور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد تقریباً پندرہ روز تک زیدی نے جو ساکت و صامت زندگی گزار دی وہ مجھے بے انتہا گراں معلوم ہو رہی تھی میں نے بارہا چاہا کہ اس کے سکوتِ بے سبب کا پردہ فاش ہو مگر برابر ناکام رہا۔ آخر کار تھک کر بیٹھ رہا۔

ایک روز وہ میرے مکان پر آیا اس حالت میں کہ اس کی آنکھوں سے بے چینی ٹپک رہی تھی میں بھی ابھی کالج سے آیا تھا اور ہاتھ منہ دھو چکا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ کالج سے آتے ہی زیدی میرے پاس چلا آیا تھا، وہی لباس جو صبح کو پہن کر کالج گیا اب تک اس کے زیب تن تھا اُس کے ہونٹ سوکھ رہے تھے میں نے اس کو اس ہیئت میں دیکھکر کہا "شاید تم نے ابھی منہ ہاتھ دھونے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی ہے، کچھ آج غیر معمولی طور پر پریشان ہو، کیا میں اسکی وجہ دریافت کر سکتا ہوں؟"

اس کے جواب میں اس نے جیب سے "گرے گرینائٹ" کا ایک رنگین لفافہ نکال کر میرے سامنے پھینک دیا۔ خط زیدی

ہی کے نام تھا اور لفافہ پر لاہور کی مہر ثبت تھی، میں سمجھ گیا کہ خط حسنین کا ہوگا اور میں اسے پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔

"پیارے زیدی

لکھنؤ میں میرا ایک ہفتہ رہ جانا مجھکو ایک خوش آیند مستقبل کا پیش خیمہ معلوم ہورہا ہے اس قلیل عرصہ میں تمھارے گھر کے تمام جزئیات کی اطلاع مجھے مل گئی۔ صوفیہ کا ذکر کئی بار سنا تھا مگر میں خود اس کے حُسن کا صحیح اندازہ اسوقت تک نہ کرسکا تھا جب تک کہ تمھارے البم میں اس کی تصویر نہ دیکھ لی۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں ایک اخلاقی گناہ کا مرتکب ہوا ہوں لیکن غیر ارادی طور پر۔ میں اپنا پائپ تمھاری میز کی دراز میں تلاش کررہا تھا کہ البم پر نظر پڑی اور مختلف فرحناک مناظر کی تصویریں دیکھنے لگا۔ اس طرح صوفیہ کو بھی میں نے دیکھ لیا۔ مجھے معاف کردو خدا کرے میرا یہ گناہ میرے آیندہ کو سدھارنے میں مدد دے بقول تمھارے اب تک میری زندگی آلودۂ معصیت رہی ہے اور ایسے ایسے کارہائے ناکردنی مجھ سے سرزد ہوچکے ہیں جن کے کفارہ کی کوئی اور صورت نہیں بجز اس کے کہ کسی ایسی ہستی سے ہمیشہ کے لئے وابستہ ہوجاؤں جو میرے مستقبل کی ضامن

بننے، میں نے صوفیہ کو اس کے لئے منتخب کیا ہے۔ آج ہی میرے
والد نے ایک تحریر مسٹر وہاج الدین کو بھیجی ہے جس میں اسی
آرزو کا اظہار کیا گیا ہے، مجھے امید ہے کہ تم اور نعمان بھی اس
معاملہ میں میری مدد کروگے اگر تمھارے البم میں صوفیہ کی تصویر
کا ہونا محض اتفاقی امر نہیں تو مجھے یقین ہے کہ تم اس کیساتھ
ایسی محبت رکھتے ہو جس کا اندازہ کرنا آسان نہیں، ورنہ تمھاری
طبیعت کا آدمی کسی دوشیزہ کی تصویر کو اپنے متبرک البم میں جگہ
دینے کا کب روادار ہوتا۔ لیکن چونکہ تم محبت کو پابند منا کحت
دیکھنا پسند نہیں کرتے اس لئے یہ امید بیجا نہ ہوگی کہ میری
ہی بہتری کے لئے ہر ممکن کوشش کرکے مجھے ممنون کروگے۔

تمھارا حسنین"

خط ختم کرکے میں زیدی کا منہ تکنے لگا۔ اس نے افسردہ
لہجہ میں کہا "اگر اب سے ایک لمحہ بھی قبل میں تم سے اس گمان
کا اظہار کرتا تو تم مجھے وہمی سمجھ لیتے، اسی لئے میں تم کو اپنے
اضمحلال و افسردگی کا سبب نہیں بتاتا تھا ورنہ جس روز حسنین
آیا تھا اسی روز میرے کان میں ایک آواز آئی تھی کہ "حسنین میری
دنیا میں آگ لگانے آیا ہے۔"

میں۔ تم یہ مجھے بتا سکتے ہو کہ حسنین کے والد کا خط چچا صاحب (وہاج الدین صاحب) تک ابھی پہنچا یا نہیں؟

زیدی۔ میں نہیں بتا سکتا۔ تم یہ کیوں پوچھتے ہو؟

میں۔ اس لئے کہ اگر نہ پہونچا ہو تو میں درمیان ہی میں اسکو غائب کر لوں اور پھر حیلہ سے حسنین کو اس خواہش سے باز رکھوں

....

زیدی۔ کم از کم مجھ سے ایسی بیہودہ باتیں نہ کیا کرو۔

میں چپ رہا اور خط اپنے منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ میرے دماغ میں ایسا تلاطم برپا تھا کہ میں اسکو چائے پلانا بھی بھولگیا زیدی سات بجے شام کو اپنے مکان پر گیا اور میں بھی اس کے ساتھ تھا وہ ابھی کپڑے بھی نہ اتارنے پایا تھا کہ وہاج الدین صاحب اس کمرے میں داخل ہوئے انھوں نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا "حسنین کے والد کا آج خط آیا ہے وہ صوفیہ کے ساتھ حسنین کی شادی کرنا چاہتے ہیں میری رائے میں صوفیہ کو حسنین سے زیادہ موزوں شوہر نہیں مل سکتا۔

زیدی۔ مجھے اس شادی سے اختلاف ہے۔

وہاج الدین صاحب:۔ تم تو ہر بات سے اختلاف کرنا اپنا فرض

سمجھتے ہو۔

زیدی۔ (اس طنز کی پروا نہ کرکے) حسنین نے نہایت نفس پرور طبعت پائی ہے وہ صوفیہ کی قدر نہ کر سکے گا۔

وہاج الدین صاحب۔ اس عمر میں ہر شخص سے کچھ نہ کچھ لغزشیں ہوتی رہتی ہیں۔ جو شادی کے بعد چلی جایا کرتی ہیں۔ اگر حسنین میں بھی اس قسم کی کمزوریاں ہیں تو وہ جاتی رہینگی وہ ہونہار لڑکا ہے صوفیہ کی والدہ کو بھی یہ نسبت بہت پسند معلوم ہوتی ہے۔ اتنا کہکر وہاج الدین صاحب چلے گئے۔ وہ یہ گوارا ہی نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی ان کی رائے سے مخالفت کرے مزاج میں استقلال ایسا تھا کہ ہر ارادے کو جلد سے جلد عملی جامہ پہنا دیتے تھے خواہ وہ ارادہ ناعاقبت اندیشی ہی پر کیوں نہ مبنی ہو۔ تیسرے دن معلوم ہوا کہ حسنین کی التجا منظور ہوگئی اور منظوری کی اطلاع بھی اس کو دیدی گئی زیدی نے بھی اسی دن حسنین کو اس مضمون کا ایک مختصر خط لکھدیا۔ "بے شک میری محبت محتاج ازدواج نہیں باوجود اس کے میں نے پوری سرگرمی کے ساتھ کوشش کی کہ صوفیہ کا دامن تمھارے دامن سے نہ باندھا جائے مگر میری شنوائی نہیں ہوئی۔ خوش ہو کہ

تمنا بر آئیگی ہیں تم کو اس کامیابی کی مبارک باد دینے کے لئے مجبور ہو گیا۔ صوفیہ کی آیندہ زندگی اگر خوشگوار ثابت ہو تو مجھ سے بڑھکر خوش قسمت کوئی نہیں"

۲۸ اگست دو روحوں کے ارتباط کی تاریخ مقرر ہوئی دو ماہ میں صوفیہ حسنین کی ملکیت ہو جائیگی۔ زیدی کی غمگینی روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ کالج میں لکچر دینے کے بعد وہ دن دن بھر خاموش رہتا مجھ سے اس کی اندوہناک اور مایوس صورت دیکھی نہیں جاتی تھی۔

ایک بار میں نے اسکی تسکین کے لئے کہا "زیدی یہ بھی ممکن ہے کہ حسنین اپنی قدیم روش سے بیزار ہو چکا ہو اور وہ صوفیہ کو خوش رکھنے کی کوشش کرے تم ابھی سے مایوس نہو"

زیدی۔ (طعن سے) ہاں ممکن ہے مگر اسوقت آفتاب کا مغرب سے طلوع ہوکر مشرق میں غروب ہونا تھا کوئی حیرتناک واقعہ نہوگا"

۱۰ اگست کو کالج میں ابوالفرح نے مجھ سے کہا "زیدی کی صحت شاید کچھ خراب ہو رہی ہے وہ ۱۵ اگست سے ایک ماہ کی رخصت چاہتے ہیں"

میں۔ ہاں ان کی صحت کو چند تفکرات سے صدمہ پہنچ رہا ہے

میں نہیں جانتا کہ اس نے اتنی طویل رخصت کی درخواست دی ہے۔ اپنا لکچر ختم کرنے کے بعد میں فوراً زیدی سے ملا اور کہا" مجھے بالکل علم نہ تھا کہ تم ایک ماہ کی رخصت لے رہے ہو کہاں جانے کا ارادہ ہے اور کس غرض سے؟"

زیدی۔ میں نے رخصت کی درخواست دے دی ہے. بمبئی جا رہا ہوں صرف تفریح کے خیال سے۔

میں۔ اور صوفیہ کی شادی میں نہیں شریک ہو گے؟

زیدی (مضطرب ہوکر) آخرکار تم نے میرا دل دکھا ہی دیا تم کو اسوقت تک میرا مافی الضمیر سمجھ لینا چاہئے تھا۔

وہ اس درجہ شوریدہ ہو رہا تھا کہ مجھ سے بھاگ جانا چاہتا تھا، میں نے اس کو روکتے ہوئے کہا" اچھا تو میں بھی رخصت لوں گا، تمھارے ساتھ رہونگا۔"

زیدی۔ تم ہر وقت میرے ساتھ رہنا کیوں چاہتے ہو؟ خواہ مخواہ میرے ساتھ گھر والوں کی نکتہ چینیوں اور انگشت نمائیوں کا مرکز کیوں بنتے ہو، تم جانتے ہو کہ خاندان کا ایک فرد بھی مجھ سے خوش نہیں۔"

میں۔ بجز صوفیہ کے۔

وہ شاید کہکر چلا گیا، میں دیر تک اسی جگہ کھڑا سوچتا رہا، زیدی جو نہایت بشاشت کے ساتھ ہر آفت کا مقابلہ کیا کرتا تھا، آج اپنے اعصاب میں اتنی تاب نہ پاتا تھا کہ صوفیہ کو اپنی خواہش کے خلاف حسنین کے حوالہ کرسکتا اس میں میرے لئے کچھ کم سامانِ بصیرت نہ تھا۔

شام کو میں نے پھر اس سے اصرار کیا "میں تمھارے ساتھ ضرور چلوں گا۔ تم تنہا نہیں جا سکتے۔"

زیدی۔ (پریشان ہوکر) لقمان زیادہ ضد نہ کرو۔ میں اپنا سر پیٹ لوں گا"۔ وہ اپنے ہوش میں نہ تھا، اس کی آنکھوں سے دیوانگی برس رہی تھی، وہ سانس اس طرح لے رہا تھا گویا، اس کا دم نکل جائیگا میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ زیدی کی دنیائے جذبات میں جو انقلاب ہو چلا تھا وہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔

زیدی۔ (ضبط کرکے) آنسوؤں کے آگے میں اپنی پیچ و تاب مقاومت قائم نہیں رکھ سکتا (پھر مجھ سے ہم آغوش ہوکر) مگر تم سے التجا کرتا ہوں کہ میرے ساتھ نہ چلو۔

میں نے جواب دیا "ذرا اپنے دل کی دھڑکن کو قابو میں کرو بلکہ اس شرط پر تمھاری التجا منظور کروں گا، اور وہ یہ کہ کسی

فوری جذبہ سے متاثر ہو کر کوئی اضطراری حرکت نہ کر بیٹھو گے اور پھر صحیح و توانا لکھنؤ واپس آؤ گے۔

زیدی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ زندہ واپس آؤں گا مگر صحیح و توانا رہنے کا وعدہ کون کر سکتا ہے؟

اس طرح زیدی اکیلا بمبئی چلا گیا اور ۲۸ ر اگست ا وہ دن جس نے ایک صاف و شفاف فضا کو سیاہ کر دیا، وہ تاریخ جس نے محبت کی کائنات کو خدا جانے کیا سے کیا کر کے میرے سامنے پیش کیا!

(۵)

فطرت کا برہم ہو جانا ایک ایسا راز ہے جسکی علت کا سمجھنا انسانی فہم و ادراک سے باہر ہے ایسے اتفاقات کو ہم "مقدرات" جیسے مبہم عنوان میں داخل کر لیتے ہیں۔

آئین فطرت کے بڑے سے بڑے حامیوں کا انجام کچھ ایسا حسرت ناک ہوا ہے کہ فطرت کی مطابقت گناہ عظیم سمجھی جانے لگی ہے اور دنیا کو چھوڑ دیا گیا کہ جس سمت چاہے چلی جائے اور زیدی کے سوانح حیات سے تو میں نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا کہ نفس کی صداقت و شرافت جو فطرت کا تقاضائے اوّلیں ہے

ہمیشہ اپنی ہی ہلاکت پر ختم ہوا کرتی ہے۔ اسی لئے شاید میں تو دنیا کی مخالفت کر کے ایسی حق پرستی کبھی نہیں کر سکتا جو زبیدی نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔ اس سے کیسی کیسی امیدیں وابستہ تھیں مگر وہ ہماری ایک امید کو بھی پورا نہ کر پایا۔

رابرٹ لوئی اسٹولنسن (Stevenson) کہہ گیا ہے کہ "محبت کے اسباب و نتائج اور اس کے آغاز و انجام میں کوئی نسبت نہیں ہوتی" اور اس لئے میرا خیال ہے کہ محبت کی کوئی منطق بھی نہیں مترتب ہو سکتی۔

صوفیہ کی شادی کو ڈیڑھ برس ہو گئے۔ آفتاب کا مغرب سے نمودار ہونا ہمیشہ کے لئے ایک انوکھی بات رہ گیا اور حسنین اپنی قدیم روش سے بیزار نہ ہوا۔ اس کی "جولانیوں" کو صوفیہ نہیں روک سکتی تھی، جب کوئی حسن ہی کی غارتگری پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ تو حسن پھر کہاں تک اپنی سطوت قائم رکھ سکتا ہے حسنین کی لغزشیں ایسی نہ تھیں جو مناکحت جیسی "نسبت مہمل" کے آگے سر نیاز خم کر لیتیں۔ مناکحت بھی وہ مناکحت جو اپنے استحکام کے لئے کوئی استوار بنیاد نہ رکھتی ہو۔

شادی کے بعد حسنین نے پانچ یا چھ مہینے صوفیہ کیساتھ

شدید انہماک اور شیفتگی میں بسر کئے مگر آخر کار وہ اس سے بھی سیر ہو گیا، اس کے ان جذبات و احساسات نے جو اتنی مدّت تک خاموش رہ چکے تھے از سرِ نو یورش کی اور حسنین نے پہلے سے کہیں زیادہ جوش کے ساتھ ان کو لبیک کہا، اس کی جدّت طلب نگاہیں روز اپنی تفریح کے لئے نت نئی رنگینیاں تلاش کرنے لگیں، وہ رات کی رات تھیٹر یا کسی حُسن کی دیوی کی آغوش میں بسر کرنے لگا۔ چھٹیوں میں وہ کبھی بنارس کبھی کلکتہ اور کبھی بمبئی چلا جاتا تھا اور اپنی ہوسناکیوں کے لئے سامانِ مسرت فراہم کرتا، بہرحال اس کی گذشتہ زندگی اپنی تمام سرمستیاں لئے ہوئے عود کر آئی۔

زیدی، حسنین اور صوفیہ کے باہمی تعلقات سے ناواقف نہ تھا۔ وہ خود اس سے کہاں تک اثر قبول کر رہا تھا، یہ تو اس کے سوا کوئی نہیں کہہ سکتا، اور وہ خود بھی کچھ نہ کہتا تھا، اس کی ظاہری صورت سے صرف یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنی دنیا میں ایک ایسی خلا محسوس کر رہا تھا جو اب کسی ترکیب سے پُر نہیں ہو سکتی تھی اور جس نے اس کی زندگی میں ایک مبہم مگر پائدار ناآسودگی پیدا کر رکھی تھی اس کی بعض حرکتوں سے ظاہر

ہوتا تھا کہ اس کے نظام ذہنیت میں کچھ بے ربطیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ اکثر جاڑے کی راتوں میں وہ غائب ہو گیا اور تلاش کرنے پر گومتی کے کنارے پایا گیا مگر کالج میں اب بھی اسی حسن و خوبی کے ساتھ سبق دیتا رہا اور اپنے فرائض کی طرف سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں ہوا۔

میں اس کی "مخزونیت" سے دل ہی دل میں کڑھتا تھا اس سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا اس لئے کہ اس کو جواب دینا گراں گزرتا تھا، کچھ دنوں سے میں اسی کے ساتھ سونے لگا تھا، کیونکہ اس کی وحشت بڑھتی چلی جاتی تھی۔ وہ رات رات بھر جاگ کر کاٹ دیتا اور صبح کو کالج میں دماغ سوزی کیا کرتا، اسکی آنکھیں سرخ رہنے لگیں، اس کا جسم ہر وقت اس طرح جلتا رہتا گویا ۱۰۴ درجہ کا بخار ہے

ایک رات میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ زیدی لیمپ جلائے ہوئے میز پر بیٹھا ہے، میں نے سمجھا کہ کوئی "نوشتۂ خونین" تیار کر رہا ہے۔ اٹھ کر اس کے قریب گیا تو حیران رہ گیا۔ "صوفیہ! صوفیہ! صوفیہ!......" وہ ایک کاغذ پر یہی لکھتا چلا جا رہا تھا:

میں نے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھکر کہا "تم نے بڑی غلطی کی کہ صوفیہ کے ساتھ شادی کرنے کی تحریک نہیں کی۔ اب تمھارا حشر کیا ہوگا!"

اس نے ایک آہ سرد کھینچی اور صرف یہ کہکر خاموش ہو رہا۔

"فکر انجامم نکن گردیدہ آغازِ من"

جینا نام ہے منقلبات کے ایک سلسلۂ نا تمنا ہی کا جنمیں سے بعض تو ایسے ہوتے ہیں جو بقائے حیات میں معاون ہوتے ہیں، مگر بعض ایسے ہوتے ہیں جو ہم کو کشاں کشاں سرزمین عدم کی جانب لے جاتے ہیں۔ زیدی کی زندگی سے متعلق جو تغیّرات ہوتے رہے وہ اس کو لحد ہی کا راستہ دکھا رہے تھے۔

صوفیہ کے ایک لڑکا پیدا ہوا اور پیدا ہوتے ہی مرگیا اس کی تندرستی اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں بہت کچھ خراب ہو چکی تھی۔ اب وہ ولادت کے سلسلہ میں بیمار پڑ گئی، اس کو کھانسی اور بخار کی شکایت رہنے لگی ایک ماہ کے بعد معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں نے دق تشخیص کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے دونوں پھیپھڑے مبتلائے مرض ہو چکے ہیں۔

دنیا کی چند ہستیاں ایسی بھی ہیں جو کبھی بھی پشیمان نہیں ہوتیں۔ حسنین کا شمار بھی انھیں میں سے تھا۔ وہ صوفیہ کے معالجہ میں کچھ روپئے ضرور صرف کر رہا تھا مگر اس کے معمولات میں ذرا بھی فرق نہ ہوا وہ دن اور رات میں مشکل سے دو ایک گھنٹہ صوفیہ کو دیتا، صبح کو دس بجے کچہری جاتا تو دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کرتا ہوا ۹ بجے رات کو گھر واپس آتا اور صوفیہ سے دست بستہ عذر خواہ ہوجاتا صوفیہ اس کو مکرد احتیال سمجھتی تھی عورت کی تسکین روپیوں سے نہیں ہوسکتی وہ خود ایسی حالت میں اپنی دنیا نثار کردیتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کے لئے بھی ایک دنیا ہی نثار کی جائے، میں یہ عام فطرت نسوانی کی بابت کہہ رہا ہوں ورنہ صوفیہ کو اس کی پروا بھی نہ تھی کہ حسنین اس کے ساتھ اپنا وقت صرف کرے وہ اس طرح مہر بلب تھی کہ حسنین نے سمجھا کہ اس کو پوری آسودگی حاصل ہے۔

زیدی نے شادی کے بعد صوفیہ کو ایک ہی بار دیکھا تھا جب کہ وہ اپنے میکہ آئی تھی وہ لاہور جاتا اپنی وضع

کے خلاف سمجھتا تھا، جب صوفیہ کے مہلک مرض کی خبر ملی تو میں نے اس سے پوچھا "صوفیہ کو دیکھنے چلو گے؟"

زیدی۔ یہ تذکرہ نہ چھیڑتے تو مجھ پر بڑی عنایت کرتے۔ میں اپنے کو سنبھالے ہوئے بیٹھا ہوں تم مجھے بے قابو کیوں کرنا چاہتے ہو؟

میں۔ اچھا تو مجھے اجازت دو کہ ایک ہفتہ کے لئے چلا جاؤں۔

زیدی۔ (تیوری چڑھا کر) تم میری اجازت کے محتاج کب سے ہوئے؟

میں۔ (طنزاً) جب جنون کا شکار ہوئے۔

زیدی۔ (پہلے سے زیادہ تند ہو کر) آخر آپ میرے جنون کے ہاتھ دھو کر کیوں پیچھے پڑے ہیں؟ آپ کر ہی کیا سکتے ہیں؟ جب انسان کو خود اپنی ذات سے ضد ہو جاتی ہے تو اس کی حفاظت کون کر سکتا ہے؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مجھے روز بروز اپنی ذات سے ضد بڑھتی جاتی ہے۔ میں دنیا کو جلا ڈالنا چاہتا تھا مگر ناکام رہا۔ اب میرا جل اٹھنا یقینی ہے دو متضاد چیزوں کا یکجا ہونا محالات سے ہے۔ جب تک کہ دونوں میں تجانس نہ پیدا ہو جائے، ان میں سے ایک کا فنا ہو جانا ضروری ہے مجھ میں اور میرے ماحول میں جو تضاد

و تقابل رہا ہے وہ آپ پر ظاہر ہے، دونوں کا متجانس ہونا ناممکن تھا اور یہ بھی دشوار تھا کہ ماحول جیسی زبردست چیز آسانی سے فنا ہو جاتی اس لئے میرا مٹ جانا لازمی ہے، آپ کہاں تک میرے بچانے کی کوشش کریں گے؟

زیدی کی مزاج کی خشونت ترقی کرتی چلی جارہی تھی وہ زیادہ تر ساکت و صامت رہتا مگر بعض اوقات اس درشتی کے ساتھ ہم کلام ہوتا کہ مجھے ناگوار گزرجاتا، آج مدت کے بعد اس نے پھر اپنی فلسفہ طرازی سے کام لیا تھا اور "صغرا و کبرا" کی ترتیب نہایت صحیح طور پر دی تھی تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے دماغ کا فعل درست نہ تھا، وہ راتوں کو تو کاغذ پر صوفیہ کا نام مشق کرتا۔ خواب میں اس کی تسبیح پڑھتا۔ لیکن جب میں نے صوفیہ کا ذکر کیا تو اس نے اس تندہی سے باتیں کیں کہ میری طبیعت بے کیف ہو گئی۔ یہ کسی صحیح الدماغ آدمی کا کام نہ تھا۔

میں ایسٹر کی تعطیل میں صوفیہ کی عیادت کو گیا۔ مجھے جو عبرت ہوئی وہ معرض اظہار میں نہیں آسکتی

وہ ہستی جو بجائے خود "رنگ و بو" کی ایک دنیا تھا۔ آج میں اس کو "پریدہ رنگ و رمیدہ بو" دیکھ رہا تھا۔ وہ بالکل زرد ہوگئی تھی، اس کا جسم یک مشت استخواں ہوکر رہگیا تھا، اب اس کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کرسکتا تھا کہ یہ وہی صوفیہ ہے جس کو زیدی اپنی دنیا کی رانی تسلیم کرچکا ہے، البتہ اس کی آنکھیں جس کے گرد اب حلقے پڑچکے تھے ابھی تک اسی طرح وحشت برسا رہی تھیں بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس کی آنکھوں میں اب وحشت کا رنگ زیادہ شوخ و تیز ہوگیا تھا۔

وہاج الدین صاحب وہاں پیشتر سے موجود تھے، میں سیدھا صوفیہ کے کلبۂ خزاں میں پہنچا۔ وہ بستر سے جنبش نہیں کرسکتی تھی، مجھے دیکھتے ہی اس کے دل میں ایک طوفان برپا ہوگیا جسے وہ روک نہ سکی، وہ پلنگ پر اٹھ بیٹھی اور بغیر کچھ کہے ہوئے مجھ سے لپٹ کر رونے لگی، گھنٹوں روئی خوب روئی، جب کچھ سکون ہوا تو اس نے مجھ سے پوچھا "بھائی جان آنے کی تکلیف نہ برداشت کرسکے"؟

اس کا لہجہ حسرتناک تھا میں بھی فیصلہ نہ کرسکا

کہ جواب کیا دوں اس کو زیدی کی اصلی حالت سے مطلع کروں یا نہ کروں آخر کار زیدی کی طرف سے یوں معذرت خواہ ہوا "پرنسپل نے کالج کے کچھ ضروری انتظامات زیدی کے سپرد کر دیئے ہیں جن کو اسی تعطیل میں انجام دینا ہے، لیکن اگر تم کہو تو ان کو آج ہی خط لکھدوں کہ وہ فوراً چلے آئیں"۔

صوفیہ۔ نہیں صرف مجھے دیکھنے کے لئے زیادہ اہم امور کو چھوڑ دینا ان کے شایان شان نہیں۔ آج میں اپنے اندر ایک غیر معمولی تلاطم محسوس کر رہی ہوں، جی چاہتا ہے کہ بھائی جان سامنے ہوتے تو ان کو اس راز سے آگاہ کر دیتی جس کی بابت قسم کھا چکی تھی کہ بستر مرگ پر ظاہر کروں گی اور وہ بھی بھائی جان کے علاوہ کسی دوسرے سے نہیں، مگر ان سے ملنے کی کوئی صورت نہیں نظر آتی میں جانتی ہوں کہ آپ اُنکے ہوا خواہ اور ہمدرد ہیں میں آپ کو اپنے دل کی داستان سنا دینا چاہتی ہوں، امید ہے آپ میری افتادگیوں کا ہدیہ ان کی خدمت میں ضرور پہنچا دیں گے۔ میرا مقصد بس اتنا ہے کہ وہ اصلیت سے ناواقف نہ رہ جائیں اور میں اپنی ہستی کو ان کی حضور میں بے نقاب کر دوں، آپ مجھے جو چاہے سمجھ

لیجئے، مگر اب میں خاموش نہیں رہ سکتی - میں ضبط کی قوت کھو چکی ہوں، اور سچ پوچھئے تو تلبیس حقیقت میں اب کوئی فائدہ بھی نہیں - مجھے بھائی جان کے ساتھ والہانہ محبت تھی اس پر اگر کوئی پرستیدگی اور عبودیت کا گمان کرتا تو غالباً بیجا نہ ہوتا مگر کچھ اپنی نسوانیت سے مجبور ہو کر اور کچھ اس وجہ سے کہ بھائی جان کی طرف سے کوئی تحریک نہیں ہوئی تھی میں نے اپنی آگ کے شعلوں کو ظاہر نہ ہونے دیا اور اندر ہی اندر سلگ کر رہ گئی، میری اس حالت اور بھائی جان کی افتاد طبیعت سے جو نتیجہ مرتب ہوتا تھا وہ یہی ہے جو آج آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں میں جانتی ہوں کہ وہ میری نوید محبت کی پذیرائی نہیں کریں گے، اس لئے میں نے بھی اپنے جذبات کو رسوا نہیں کیا اب میں اس راز کو فاش کئے دیتی ہوں تاکہ آئندہ کسی طرح کا فریب باقی نہ رہ جائے آپ میرے بھائی جان ہوتے ہیں اور بھائی جان کے دلی ہمدرد - مجھے پورا اعتماد ہے کہ آپ میرے درد کا افسانہ ہر شخص کو سنا کر میرے غرور کو پامال نہ کریں گے - اسی وجہ سے میں نے آپ کو اپنا ہمراز بنایا ہے، جس روز میرا نکاح

ہونے والا تھا، اسی روز مجھے اپنی دنیا تاریک نظر آرہی تھی میری رگ رگ میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی، تھوڑی دیر کیلئے میرے دماغ میں یہ بات جم گئی کہ میرا مرجانا زیادہ اچھا ہوگا میں بھائی جان کے کمرے میں گئی اور ان کے فوٹو گرافی کے سامان کا جائزہ لینے لگی، ایک دفعہ انھوں نے ایک سفید رنگ کی دوا کو کہا کہ وہ نہایت سریع التاثیر زہر ہے (یہ المونیم سلفو سیانائڈ تھا) میں نے اس کو پہچان کر نکالا اور عرصہ تک غور کرتی رہی، میں آپ سے سچ کہتی ہوں اسوقت میں اپنی نگاہ میں ذلیل ہوگئی تھی، آخرکار مجھے بھی ضد ہوگئی کہ جب بھائی جان نے مجھے ہوا کے مخالف جھونکوں میں چھوڑ دینا پسند کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ میں ان سے بچنے کی کوشش کروں مجھے اپنا قصہ سناتے ہوئے حیا آنی چاہیئے، مگر کروں کیا میری ساری قوتِ احساس زائل ہوچکی ہے میں اب کسی بات سے متاثر نہیں ہوسکتی، اس کے علاوہ مجھے اطمینان ہے کہ دنیا مجھے جو چاہے سمجھ لے لیکن میں نے اب تک جو کچھ کیا وہ اچھا کیا اور اب بھی جو کچھ کررہی ہوں وہ کوئی عیب نہیں صوفیہ اپنی درد ناک روداد سنارہی تھی اور میں سکتہ کے عالم میں سن رہا

"تھا۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکی تو پھر مجھ سے لپٹ کر رونے لگی، میں بھی ضبط نہ کر سکا۔ بیساختہ آنسو نکل پڑے۔ میں نے اس کی تشفی کرتے ہوئے کہا" صوفیہ اب میں بھی واقعات کو چھپانا نہیں چاہتا، جب سے تم میسور سے آئی ہو زیدی تمھاری پرستش میں مشغول ہے اور اب تک اس نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ تمھارے ہی تصوّر میں صرف کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا ذوق محبت ہی نرالا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی دنیا کو جنھے فرخناک بنایا وہ تم ہی ہو، آج تک اس نے کسی عورت کی محبت نہیں کی، اور مجھے یقین ہوگیا تھا کہ وہ اس حسنِ لطیف سے بیگانہ رکھا گیا ہے، مگر تم نے آکر اس کے ان جذبات کو ابھار دیا جو اب تک اس کے دل کے عمق میں پوشیدہ تھے، میں روزِ اوّل ہی سے اس کا راز دار ہوں۔ میرے سوا کسی کو اس کے واردات قلب کا صحیح علم نہیں ہو سکتا، تمھاری شادی ہو جانے کے بعد اس کے دماغ میں فتور آگیا اس کے حواس مختل ہو گئے ہیں وہ آدھی رات کو تمھارا نام کاغذ پر لکھتا رہتا ہے، خواب میں تم کو پکارتا ہے اس کی قوت

فیصلہ بھی کھو چکی ہے، اس کو واقعی کالج میں کوئی کام نہ تھا میں نے اس سے آنے کے لئے اصرار کیا مگر وہ نہیں آیا۔ اس کی ضد بہت بڑھ گئی ہے"۔

صوفیہ۔ (آہ کر کے) مجھے ان کی محبت کا گمان اسی وقت ہو گیا تھا جب کہ وہ ایک ماہ کی رخصت لے کر بمبئی چلے گئے اور میرے نکاح میں نہیں شریک ہوئے۔ آج آپ نے میرے اس گمان کی تصدیق کر دی کہ میری محبت کے حقوق در پردہ ادا ہوتے رہے ہیں۔ لیکن جیسی ہماری محبت نرالی تھی ویسا ہی اس کا انجام نرالا ہے۔

میں۔ تم پریشان نہ ہو، میں زیدی کو ضرور بلا لونگا، خدا کرے تم جلد صحت یاب ہو جاؤ تو اب بھی بہت کچھ تلافی مافات ممکن ہے۔

صوفیہ۔ اگر مجھے صحت یاب ہونا ہوتا تو اپنے محسوسات کو اپنے دل ہی میں چھپائے رہتی۔

یہ کہکر وہ خاموش ہو رہی۔ اتنے میں وہاج الدین صاحب نرس کے ساتھ داخل ہوئے۔ یہ نرس صوفیہ کی نگہداشت کے لئے مقرر ہوئی تھی اور روزانہ صبح و شام آیا کرتی تھی اس نے صوفیہ کو بیٹھے دیکھکر کہا "آپ کو سمجھا دیا گیا تھا کہ حرکت

کرنا آپ کے حق میں سم قاتل ہے اور پھر آپ بیٹھی ہوئی ہیں"
صوفیہ۔ بس صاحبہ۔ پڑے پڑے جی گھبرا گیا اس لئے دل
بہلانے کے لئے ابھی اٹھکر بیٹھ گئی تھی۔ نرس نے تھرمامیٹر
لگا کر دیکھا تو ۱۰۲ درجہ کا بخار تھا، اس نے پھر نبض پر
ہاتھ رکھکر کہا "معلوم ہوتا ہے آج آپ نے اپنے اعصاب
پر بہت زور دیا ہے، دیکھئے بخار بھی بڑھ گیا اور نبض بھی
سریع ہوگئی للہ آرام کیجئے، آپ تو اپنی زندگی سے اکتائی ہوئی
معلوم ہوتی ہے"

صوفیہ میری طرف دیکھکر خاموشی کے ساتھ لیٹ رہی

حسنین مجھے دکھانے کی غرض سے اس دن کئی بار صوفیہ
کا حال دریافت کرنے آیا اور دو ایک خوراک دوا بھی اپنے
ہاتھ سے اسے پلائی، مگر ہر بار یہی گوشش گزار کرتا رہا کہ
آجکل کچہری کا کام اس قدر ہے کہ سانس لینے کی فرصت نہیں
ملتی۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ اس سے کوئی گفتگو کروں اور
وہ بھی مجھ سے زیادہ باتیں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ رات
کو میں زیدی کو خط لکھنے جا ہی رہا تھا کہ وہاج الدین صاحب
نے مجھے بلا کر کہا "تم کل ہی لکھنؤ جاؤ اور صوفیہ کی والدہ کو

ہمراہ لے کر چلے آؤ، مجھے زیدی سے کوئی یقینی اُمید نہیں
کہ وہ اس کام کو انجام دیں گے" میں تیار ہو گیا،
چلتے وقت صوفیہ سے کہدیا تھا" میں پچی (صوفیہ کی والدہ)
اور زیدی کو بلانے لکھنؤ جا رہا ہوں تم مایوس نہ ہونا"
صوفیہ نے کراہ کر کہا" جایئے۔ دیکھئے پھر ملاقات ہو یا
نہ ہو میری عزت نسوانی کا خیال رکھیے گا اور میرا تحفہ نیاز
بھائی جان تک پہنچا دیجئے گا"

(۶)

لکھنؤ پہنچ کر میں نے فوراً صوفیہ کی والدہ سے سامان
سفر تیار کرنے کو کہا اور پھر زیدی سے ملنے کے لئے چلا۔ وہ
اپنے کو کمرے میں بند کئے ہوئے تھا، میں نے زور سے دستک
دی تو اس نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھتے ہی پوچھا
"جلد بتاؤ صوفیہ کیسی ہے"
میں۔ اس کی حالت خطرہ سے خالی نہیں۔ مگر تمھیں اس
سے کیا غرض۔ یاد رکھو کہ تم ایک خوفناک گناہ کے مرتکب
ہوئے ہو اور تمھارے ضمیر کو عمر بھر کے لئے داغدار ہو جانا چاہئے
اس کے بعد صوفیہ نے جو کچھ مجھ سے کہا تھا حرف بحرف

اس سے بیان کر دیا۔

زیدی کو آج میں نے پہلی بار روتے دیکھا اور غالباً وہ پہلی بار رویا بھی تھا۔ میرا دل بھر آیا۔ وہ خاموش تھا اور بڑے بڑے قطرہائے اشک اس کے عارض پر ڈھلک رہے تھے اس کی خوبصورت آنکھیں اور بھی سرخ ہوگئی تھیں مجھے خوف تھا کہ آنسو کے بجائے کہیں خون نہ ٹپک پڑے میری آواز میرے حلق کے اندر گھٹ رہی تھی، میں نے کوشش کر کے کہا "اب رونے سے کیا فائدہ، یہ تو بتاؤ اب بھی میرے ساتھ لاہور چلو گے یا نہیں؟"

زیدی۔ (اپنے سر کو زور سے جھٹک کر) ہاں ضرور چلوں گا تم نے سچ کہا۔ میرا ضمیر اس طرح زخمی ہوا ہے، کہ اب اندمال دشوار ہے، مجھ سے ایک ناقابل معافی غلطی سرزد ہوئی ہے اس کی پاداش میں میں اپنی وہ عزیز چیز کھو رہا ہوں جس کی بازیافت ناممکن ہے، یہ بھی یقین کر لو کہ اپنی ساری عمر میں یہی ایک غلطی مجھ سے ہوئی ہے جس کے بعد پھر کوئی غلطی کرنے کا موقع شاید نہ ملے، صوفیہ کی شادی ہوتے ہی مجھ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور میرے دل نے کہدیا تھا

کہ صوفیہ کے ساتھ میرا شادی نہ کرنا اس کی اور اپنی ہلاکت کو دعوت دینا تھا، اس لیئے میں صوفیہ کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کو دیکھکر میرے دل میں حسرتوں کا ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا اور میں بے لبس ہونے لگتا تھا۔ یہ کچھ میں کہہ رہا ہوں شاید تم اس کو نہ سمجھ سکو، مگر حقیقت یہی ہے۔ اس نے اور کچھ نہ کہا۔ اس کی گویائی اس سے چھن گئی تھی اور اب وہ کسی بات کی زیادہ تفصیل و تشریح نہیں کرسکتا تھا وہ کرسی سے اٹھا تو اس کو چکر سا آنے لگا اور جب بستر پر جاکر لیٹ رہا تو اس پر غنودگی سی طاری ہوگئی میں ڈرا کہ کہیں اس کا قلب ساکت نہ ہو جائے، اس لئے اس کے قریب جاکر اس کی نبض پر ہاتھ رکھا اس نے جواب دیا "تم متوحش نہ ہو، میں مر نہیں رہا ہوں"

اس کے بعد وہ کئی مرتبہ رویا، مجھے کسی انگریزی مصنف کا قول یاد آرہا تھا کہ "ہر مصیبت کسی نہ کسی غلطی کی وجہ سے نازل ہوتی ہے" یہ دوسری بات ہے کہ ہم کو اس غلطی کے وقوف مطلق نہ ہو، یہ تو میں کہہ نہیں سکتا کہ زیدی نے صوفیہ کی زندگی تباہ کی، مگر اس میں بھی شک نہیں کہ صوفیہ

تباہی اور زیدی کی محال پردازیوں کے درمیان کوئی علاقہ علت ضرور تھا، صوفیہ کے دق میں مبتلا ہونے کا باعث تو وضع حمل ہوا مگر زیدی کی غلطی نے اس جانکاہ حادثہ میں کم ازکم "علت بالواسطہ" کا حصہ ضرور لیا۔

چھٹی ختم ہو چکی تھی اس لئے میں نے اور زیدی نے وہیں روز کی رخصت لی اور صوفیہ کی والدہ کو ساتھ لیکر لاہور روانہ ہو گئے، مگر آہ! وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ صوفیہ ایک گھنٹہ قبل ہی پیام اجل قبول کر چکی ہے، اور اب اس کو سپرد خاک کرنے کا سامان ہو رہا ہے۔

وہاج الدین صاحب نے دوڑ کر زیدی کو لپٹا لیا اور رو کر کہا "صوفیہ نے وصیت کی تھی کہ اگر تم اس کے بعد آؤ تو میں تمھیں اس کی روح کی طرف سے "خوش آمدید" کہوں آج تک میں نہیں جانتا تھا کہ صوفیہ میں اور تم میں ایسی گہری محبت تھی۔ صوفیہ نے دم نکلنے سے پہلے کہا تھا کہ ہوا کسی کو نہیں یاد کیا مجھ سے بڑی غلطی ہوئی، افسوس! صوفیہ کو میں نے مار ڈالا۔"

مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ دنیا صرف غلطیوں کا ایک

مجموعہ ہے ایک طرف زیدی اپنی فروگذاشتوں کا اعتراف کر رہا تھا تو دوسری طرف وہاج الدین صاحب، حسنین ہم لوگوں سے فاصلہ پر خاموش بیٹھا تھا اس کے آنسوؤں کو بھی اس سے نفرت ہوگئی تھی، وہ رہ رہ کر کوشش کرتا مگر اس کے آنسو نہیں گرتے تھے، زیدی چند لمحوں تک ساکت کھڑا رہا۔ پھر دوڑ کر صوفیہ کی میت کے پاس گیا اور کچھ دیر اسکی پلنگ کے قریب خاموشی کے ساتھ آنسو گراتا رہا۔ جب لوگ جنازہ اٹھانے کے لئے آئے تو اس نے صوفیہ کا چہرہ کھولا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیکر کہا "جاؤ" یہ وہ سماں تھا جو دیکھنے والوں کے دل میں نشتر توڑ گیا۔ میری تو ہمت نہیں ہوئی تھی کہ زیدی کی تسلی میں کروں۔

وہ صوفیہ کی قبر تک نہیں گیا اس نے کہا "میں اس کا مزار اپنے دل میں بنا چکا ہوں اب اس کو مٹی میں نہیں ملا سکتا۔"

اس کے بعد زیدی کو کسی نے ہوش و حواس سے باتیں کرتے کبھی نہیں دیکھا، وہ دیوانہ ہوگیا اور اپنے گذشتہ

وجود کو یکقلم بھول گیا۔ اس نے کالج جانا چھوڑ دیا، اس کو یاد بھی نہ رہا ہوگا کہ وہ کبھی "نفسیات" کا پروفیسر تھا۔ میں ہزار چاہتا تھا کہ وہ اپنے کیفیات ذہنی کا کچھ اظہار کرے، لیکن بے سود، وہ میری صحبت ہی میں بہت کم رہتا، کبھی دن کا دن اور کبھی رات کی رات گھر سے غائب رہتا اور شہر کے اجڑے کھنڈروں میں یا دریا کے کنارے اپنا وقت صرف کرتا، جب گھر پر ہوتا تو اپنے کو کمرے میں بند کئے رہتا، وہ کبھی دیمقراطیس کی طرح قہقہہ لگاتا اور کبھی ہرقلیطوس کی طرح رونے لگتا۔ میرے ساتھ وہاج الدین بھی اس کے پیچھے سر دھنا کرتے۔ اس کو مجبور کر کے اپنے پاس بٹھلاتے مگر وہ پانچ منٹ میں دارفتہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ اس طرح سات آٹھ مہینے ہو گئے۔

ایک دن زیدی کو شدید تپ چڑھی اور تشنج کے آثار نمایاں ہونے لگے، دوسرے روز ڈاکٹروں نے دیکھا تو "ورم نخاع" (Myelitis) تشخیص کیا، وہ بیہوش پڑا رہنے لگا، اس کی گردن کسی قدر خم ہو گئی تھی، اس مرض سے کوئی جانبر نہیں ہوا کرتا۔ زیدی بھی بچ نہ سکا اور بہت جلد اپنی "فردوسی تیتری"

سے ہمکنار ہوگیا یہ اس کی تیسویں سالگرہ تھی۔

اس کا ماتم کرنے والے کم تھے، اس کی بیوہ ماں اور اس کی چھوٹی بہن کی حالتیں قلمبند نہیں کی جاسکتیں ان کی مصیبتوں کا ہر وہ شخص اندازہ کرے جس پر کبھی ایسا وقت پڑا ہو۔

زیدی مرتے دم تک دنیا سے نرالا رہا، ڈاکٹروں سے معلوم ہوا کہ جو بیماری اس کو لاحق ہوئی تھی اس میں بہت کم لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔

یہ ہے اس ہستی کا انجام جس کو میں نے زیدی کے نام سے روشناس کرایا ہے۔ اب میرے لئے بھی کوئی لطف باقی نہیں رہا، زیدی کی وجہ سے میں بھی اپنی زندگی کو رومانیت اور شعریت سے معمور پاتا تھا، اس کے نہ ہونے سے میری آدھی زندگی بیکار ہوگئی ہے؟

صورتیں کیا کیا ملی ہیں خاک میں!!!

(۷)

کون ہے جو زیدی کی معصومیت اور صداقت کا معترف نہیں ہو جائیگا۔ تاہم اتنا کہوں گا کہ اس کے عجیب و غریب خیالات

سے جو اس کی اور اس کے چاہنے والوں کی زندگی کو خراب کردیا۔
وہ دنیا کو اپنی امیدوں کے مطابق دیکھنا چاہتا تھا لیکن میرا
خیال ہے کہ اگر آج اس کی یہ آرزو پوری ہوگئی ہوتی تو کوئی
ہیئت اجتماعی قائم نہ رہ جاتی، انسان انفرادی صورت میں جتنی
"جنون جولانیاں" اور "وحشت خرامیاں" چاہے کرلے مگر جب
وہ جماعت کے ایک رکن کی صورت اختیار کرلیتا ہے تو اس
کو ضوابط کی بے پناہ بندشوں میں جکڑ جانا ہی پڑتا ہے زیدی
مصلحت اندیشی سے چڑھتا تھا، جھوٹ بولنے سے اسکو
نفرت تھی، یہ سب من حیثیت الفرد انسان کی بہترین خوبیاں
ہیں، مگر دنیا بغیر کذب و افترا اور مکر و احتیال کے بالکل
بے رنگ و بو ہوجائیگی بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ نظام عالم
ہی درہم برہم ہو جائے گا، جماعت کی طرف سے انسان پر
جو فرائض عائد ہوتے ہیں، ان کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم آپ
اپنی اپنی زندگیوں کو قائم رکھنے اور اپنے کو کامیاب بنانے
کے لئے ہر ممکن کوشش کریں، ورنہ انفرادی نقطۂ نظر سے
برنرڈ شا کا کہنا بہت درست ہے کہ "زندگی ایک مرض ہے"
اور شوپنہار کی تعلیم خودکشی ہماری نجات کی بہترین صورت

تھی، ہمارا مر رہنا زیادہ مستحسن تھا۔

کم از کم زیدی کے مخصوص "تخیّل محبت" نے تو ضرور اس کے افسانۂ حیات کو عبرتناک بنا دیا وہ اگر صوفیہ کے ساتھ کوشش کر کے شادی کر لیتا تو بہت ممکن تھا کہ باوجود ایسے تباہ کن خیالات کے وہ زندہ رہتا اور کوئی نہ کوئی کارنمایاں کر جاتا اس صورت میں شاید صوفیہ بھی قبل از وقت اُکتا کر دوسری دنیا میں نہ جا بستی۔

مگر غلطی پہلے ہی سے غلطی نہیں معلوم ہوتی، ہم کو اپنی نادانیوں کا احساس اسوقت ہوتا ہے جب نتائج مترتب ہو چکتے ہیں، اور ان کا مقابلہ کر کے ان کو زیر کر لینا ہمارے بس کی بات نہیں رہ جاتی۔

اب مجھے زیدی کی زندگی سے متعلق ایک اور دلچسپ واقعہ کی خبر ملی ہے جس کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھ لیجئے :-

ایک روز ڈاک سے مجھے ایک خط ملا، انداز تحریر غیر مانوس تھا۔ لفافہ چاک کر کے سب سے پہلے میری نظر

دستخط پر پڑی اور میں متعجب ہوا۔ خط مس مہروان جی کا تھا،
جس کو میں اسی طرح نقل کئے دیتا ہوں۔

"ڈیر لقمان!

مدت سے مسٹر زیدی کی موت پر میں ماتم کر رہی ہوں،
مجھے یاد ہے کہ میں نے کسی اخبار میں تعزیت نامہ پڑھا تھا
اور میرا دل تڑپ کر رہ گیا تھا، ابو الفرح صاحب سے
معلوم ہوا کہ آپ نے مسٹر زیدی کے مرجانے پر اپنا دل
بہت دکھایا ہے اور اب آپ ان کی لائف لکھ رہے ہیں۔ میرا
خیال ہے کہ اس طرح ان کی بہترین یادگار قائم رہے گی
اس خیال کا لحاظ کرتے ہوئے میں بھی ایک ماجرا سناتی
ہوں، میں چاہتی ہوں، کہ مسٹر زیدی کی داستان کا کوئی
حصہ معرض خمول میں نہ رہنے دیا جائے۔

شاید میری نگاہوں سے آپ بھی پہچان گئے ہوں
کہ لکھنؤ میں "مرنے والے" کے اثرات بہت کچھ قبول کر رہی
تھی واقعہ یہ ہے کہ میرے دل میں مسٹر زیدی کے لئے دفعتاً
ایک معبد تیار ہوگیا تھا، اگرچہ اتنی ہمت نہ ہوئی تھی کہ
اپنے "دیوتا" کے سامنے اپنے احساس عبودیت کا اظہار

کر ڈالوں، مجھے یقین ہو گیا کہ دنیا میں میرا جو مالک ہو سکتا ہے اور اپنے کو میں جس کے سپردگی میں دے سکتی ہوں، وہ مسٹر زیدی ہیں ۔ آہ! میں نے ان کو "دیوتا" سے بھی زیادہ برتر تسلیم کر لیا تھا، مجھے جھوٹا نہ سمجھئے، میں آگ سے کہیں زیادہ ان کا احترام کرنے لگی تھی مگر ان کی روکھی طبیعت میرے دل کی آگ کو افسردہ کئے دیتی تھی۔

میں اپنی حسرتوں کو لئے ہوئے بمبئی چلی آئی اور ایک طویل "تپش نامۂ تمنا" مسٹر زیدی کی خدمت میں بھیجا۔ انھوں نے اس کے جواب میں محض اتنا لکھا "اگر آپ کو فی الحقیقت میرے ساتھ ایسی ہی محبت ہے تو آپ کی زبان سے اس کا اعتراف مجھے سخت تکلیف پہونچا رہا ہے، امید ہے کہ آئندہ آپ اس "صہبائے آتشیں" کو اپنے پیمانہ سے باہر نہ چھلکنے دیں گی" میرے دل کو ٹھیس لگی اور میں نے پھر کبھی ان سے اپنی تشنگی کی داد نہیں چاہی۔ سُنا ہے کہ اس کے بعد وہ ایک دفعہ بمبئی بھی آئے تھے، مگر مجھ سے نہ ملے اس خیال سے مجھے جنون ہونے لگتا ہے کہ میں ان کو دوبارہ نہ دیکھ سکی۔

میں نے عہد کرلیا تھا کہ یا تو اپنا "سرمایہ حیات" مسٹر زیدی کی نذر کردوں گی یا عمر بھر تجرد میں بسر کردوں گی میں اپنے اس عہد سے کبھی منہ نہیں پھیر سکتی اور "گنبد خموشاں" میں بھی سوگوار ہی جاؤں گی۔

میں ہوں

اپنے دیوتا کی پرستار

مس مہروان جی

مجھے زیدی اس وقت فرشتہ نظر آرہا تھا جو آخر وقت تک ہر آزمائش میں کامیاب رہا۔

"از وفاداران ویاران یاد باد"

—

مجنوں

ہماری زیر طبع کتابیں

ٹولی گردی۔ حضرت عبدالستار صاحب فاروقی (جرنلسٹ) اڈیٹر ہفتہ وار اخبار الفاروق کامٹی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے اس مجموعہ میں تراجم شامل ہیں جو زیادہ تر گجراتی، ہندی بنگالی اور انگریزی زبان سے لئے گئے ہیں۔

چندرماں کی باتیں۔ مہاشے ایس، بی نیر کر ایم۔ اے۔ ال۔ بی کے ادبی شہ پاروں کا گراں قدر صحیفہ ہے، یہ صحیفہ اردو ادب میں ایک نشان راہ ثابت ہوگا۔

خاک و خون۔ دنیا کے انقلاب کی بہترین خونچکاں نظمیات کا مجموعہ ہے جو شاعری کی دنیا میں اپنی نظیر ہوگا۔ مرتبہ عثمان اقبال

بے بال و پر۔ حضرت قادر نیازی کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ پاکٹ سائز کے ۱۲۵ صفحات پر مشتمل ہوگا۔

رین بسیرا۔ محترمہ خورشید جہاں کے چوبیس دلکش کہانیوں کا حسین ترین مجموعہ ہے۔

ناشر: سی۔ پی اردو اکاڈمی، کراڈک روڈ ناگپور سٹی

سی پی اُردو اکاڈمی ناگپور کی اوّلین پیشکش

موت و حیات

از

جواں فکر شاعر حضرت شاطر حکیمی کامٹی

"ــــــ مجموعہ ہے جناب شاطر حکیمی کی نظموں اور غزلوں کا جناب شاطر صوبہ متوسط کے مشہور نوجوان شاعر ہیں۔ ان کے کلام کی خصوصیت بیان کی سادگی ہے جو مشکل و دقیق مسائل میں بھی ہاتھ سے نہیں جاتی۔ شاطر کا شمار بھی ترقی پسند شعراء میں کیا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی ادب برائے زندگی کے قائل ہیں ــــــ"

از ــــ "رئیس التحریر" حضرت نیاز فتحپوری
اڈیٹر ماہنامہ نگار لکھنؤ!

"ــــــ موت و حیات میں بیشتر نظمیں مرکزی خیال اور اسلوب دونوں کے خیال سے قابل قدر ہیں۔ شاطر حکیمی صاحب کی اکثر نظمیں نئی زندگی کا بھرپور احساس لئے ہوئے ہیں ــــــ" از حضرت مجنوں گورکھپوری

صفحات ڈیڑھ سو سے زائد ـــــ بہترین گرد پوش و کاغذ ـــــ قیمت ۲ روپیہ ۸ آنہ

سی پی اُردو اکاڈمی کراڈک روڈ ناگپور سٹی

سی پی اردو اکاڈمی

کے

مستقل لکھنے والے

مجنوں گورکھپوری

اختر حسین رائے پوری

خواجہ احمد عباس (جرنلسٹ)

فراق گورکھپوری

پروفیسر منظور حسین شور

عبدالستار فاروقی اڈیٹر ماہنامہ ''الفاروق'' کامٹی

خیام ہندی

شاطر حکیمی

ریاض روفی

دکھی پریم نگری

قادر نیازی

خورشید جہاں

عثمان اقبال

مہاشے نیر کر ایم، اے، ایل، ایل، بی

پنڈت کرشنانند سوختہ

محترمہ سحر اڈیٹر ماہنامہ "تنویر" بمبئی

اسٹار پبلشرز اینڈ پرنٹرس

حیدرآباد دکن